طائرِ خیال

تاج کمپنی لمیٹڈ لاہور

طائرِ خیال

مہاشہ سُدرشن کے بارہ ۱۲ نہایت مُفید افسانوں کا مجموعہ

ناشران
تاج کمپنی لمیٹڈ۔ قرآن منزل
ریلوے روڈ۔ لاہور

دیباچہ

افسانہ نویسی کی ابتدا کس نے کی؟ کب کی؟ کس طرح کی؟ یہ سب ایسے سوالات ہیں جن کا جواب تاریخ کے اوراق میں نہیں مل سکتا لیکن افسانہ کے متعلق وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ چیز اتنی ہی پرانی ہے جتنی دُنیا RICHARD BURTON نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف MASTERS OF THE ENGLISH NOVEL میں ایک جگہ لکھا ہے کہ کہانی دُنیا کی سب سے محبوب شے ہے اس لئے عجب نہیں کہ اس کی ابتدا اُسوقت ہوئی ہو جب آدمی نے گھٹنوں کے بل کھڑا ہونا سیکھا ہو۔ لیکن میرا خیال ہے، کہانی اس سے بھی قدیم ہے۔ اس کا آغاز اُس وقت ہؤا جب دُنیا کے پہلے بیٹے نے پہلی مرتبہ ہوش کی آنکھ کھولی۔ آسمان کے تلے کسی دلفریب منظر کو محبّت کی نگاہ سے دیکھا اور اُسے خانۂ دماغ میں محفوظ طور پر رکھ لیا۔ اسوقت ابھی قُدرت نے اُس کے ہونٹوں سے چُپ کی مُہر نہ توڑی تھی۔ نہ اُسے اپنے جذبات کے اظہار کا کوئی طریقہ معلوم تھا۔ وہ صرف دیکھتا تھا اور سوچتا تھا۔ اس کے بعد MR. MARVIN. کے قول کے مطابق اُس نے اپنے اردگرد کی چیزوں کی نقل اُتارنا شروع کیا اور درختوں کے تنوں پر اور چٹانوں سے کھُردرے پتھروں پر تصویریں بنانے لگا۔ اِن تصویروں میں کمال نہ تھا نہ آجکل کی خوبصورتی تھی اسانپ اور نیولے کی لڑائی، شیر اور ہاتھی کا شکار، دیوی دیوتاؤں کی پوجا کے سوائے ان میں

اور کچھ بھی نہ تھا۔ عوام کے لئے یہ ابتدا بالکل حقیر اور بے معنی ہے۔ لیکن یہی حقیر اور بے معنی ابتدا ہے جو آج نشو ونما پاکر مازو بالزاک، گی دماپاسال، ہیسن کائی وز، اناطول فرانس، لیو ٹالسٹائے، جیک لنڈن، بنکم چندر، رابندر ناتھ ٹیگور اور شرت چند چٹرجی کی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہے۔ یہ وہی ذرہ ہے جو آج آفتاب بن کر چمک رہا ہے۔ یہ وہی ذرا سا بیج ہے جو گھنے تناور درخت کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ اور جون جولائی کی بے پناہ گرمی کے ستائے ہوئے مسافروں کے لئے راحت آرام اور اطمینان کا جیتا جاگتا سندیسہ بن کر کھڑا ہے۔

انسانی فطرت تغیر پسند ہے۔ آدمی ایک ہی شے کو ایک ہی رنگ روپ میں دیکھ کر اوب جاتا ہے۔ کچھ زمانہ کے بعد وہ درختوں اور پتھروں کی تصویروں سے اُکتا گیا اور اپنے دل بہلاؤ کے لئے کسی اور چیز کو ڈھونڈنے لگا۔ اُدھر اس اثنا میں قدرت نے اُسے بولنا سکھا دیا، اور وہ سورمائوں، خوفناک درندوں اور قدرت کی عالمگیر طاقتوں کے گیت گانے لگا۔ کہانی گیتوں کی گود میں پرورش پانے لگی۔

عہد طفلی کا زمانہ ختم کر کے یہ ہونہار بچہ گیتوں کی گود سے اُترا اور اپنے پاؤں چلنے لگا۔ کبھی گرتا تھا، کبھی ٹھوکریں کھاتا تھا، کبھی اس کے کپڑے کانٹوں کی جھاڑیوں میں اُلجھتے تھے۔ مگر یہ بہادر من چلا ان روکاوٹوں کی ذرا پروا نہ کرتا تھا، اور برابر آگے بڑھا چلا جاتا تھا۔ اس سفر میں اُسے سب سے پہلے ایک گلزار نظر آیا۔ بچہ تھا ریجھ گیا اور کچھ دنوں وہیں رُکا رہا، پھل پھول کھاتا تھا۔ طوطا مینا اور ہرنوں کے ساتھ کھیلتا تھا، اور ندی کے کنارے بیٹھا چین کی بنسی بجاتا تھا۔ اس کے بعد ایک

طلسم خانہ میں جا پھنسا، وہاں سے چھوٹا تو حسن و عشق کی بھول بھلیوں میں بھٹکنے لگا۔ کچھ زمانہ ان آہوں اور گناہوں میں کٹا اور اس کے بعد چشم حقیقت وا ہو گئی۔ خیال آیا کتنی حماقت ہوئی کہ جوبن کے چسکوں میں گھر بار کی یاد ہی نہ رہی، یہ خیال آنا تھا کہ مہاتما جی لوٹے اور چپکے سے گھر کا دروازہ کھول کر اندر چلے گئے۔ اور خانہ داری کی زندگی بسر کرنے لگے۔ آج اُس کے بحر دل میں حسن و شباب کی لہریں نہیں اُٹھتیں، نہ چڑیوں اور کوّوں کو دیکھ کر اُس کی طبیعت بے چین و بے قرار ہوتی ہے۔ اب وہ اپنے مقاصد کو پیش نظر رکھنے والا شریف، خانہ دار ہے۔ جس کی تمام تر توجہ اپنے گھر میں مرکوز ہے۔ وہ گھر سے باہر بھی جاتا ہے ہنستا بھی ہے، گاتا بھی ہے، کبھی کبھی پرانے یار دوستوں کی چنڈال چوکڑی میں بھی چلا جاتا ہے، لیکن اُس کا دل اپنے گھر ہی میں رہتا ہے ٭

یا سیدھے سادے الفاظ میں یوں کہیں گے کہ کہانی کا پہلا دور وہ تھا، جب رات کو بچے گھر کے آنگن میں کھیلتے تھے، یا بڈھے آگ تاپتے تھے اور جنگلی جانوروں کی کہانیاں کہتے تھے، معلوم ہوتا ہے پنچ تنتر اور ایسپ کی کہانیاں اُسی قدیم زمانہ کی بچی کھچی یادگاریں ہیں، ان میں دلکشی ہو یا نہ ہو، لیکن یہ نصائح کے موتیوں سے بھری پڑی ہیں۔ اس کے بعد دوسرا عہد جادو اور طلسم کا عہد تھا۔ لوگ عجیب و غریب افسانے مانگنے لگے، جیسے الف لیلا، چہار درویش، طلسم ہوشربا کی کہانیاں ہیں۔ ان میں دلکشی ہے ان میں کشش کی طاقت ہے۔ لیکن دنیا اور دنیا کے قواعد دونوں پیچھے پڑے ہیں۔ یہ کہانیاں ہماری دنیا کی نہیں، کسی اور دنیا کی ہیں، جسے ہم نے نہ دیکھا ہے نہ کبھی دیکھنے کا

امکان ہے وہاں کہیں کبوتر دیکھتے دیکھتے نوجوان شہزادہ بن جاتا ہے، کہیں چشم زدن میں محل کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کہیں کٹے ہوئے سر ہنستے ہیں، کہیں لاشیں گھوڑوں پر سوار ہو کر جنگ کرتی ہیں۔ یہ بے تکی بے سر پیر کی کہانیاں پڑھ کر لوگ دنگ رہ جاتے ہیں، وہ خوفزدہ ہو جاتے ہیں، اُنہیں کھانے پینے کی سُدھ نہیں رہتی۔ لیکن کہانی کے خاتمہ پر اُن کا دل کہہ دیتا ہے کہ ہمارا وقت ضائع گیا۔ پھر تیسرا دور شروع ہوا۔ اور عشقیہ کہانیوں کا آغاز ہوا۔ اُن میں چاند کی چاندنی، پھولوں کی بُو اور رشیا ما کے پُر سحر نغمے ہیں، اُن میں شاعری ہے، اُن میں تخیّل ہے، ان میں کشش ہے، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اُن میں انسانی فطرت کی تشریح ہے۔ لیکن اُن میں ایک عیب ہے، دُنیا اُن سے اُوپر نہیں اُٹھتی نیچے گرتی ہے۔ یہاں پر یورپ اور ہندوستان کے درمیان ایک خط امتیازی حائل ہے۔ یورپ کہتا ہے۔ کسی ایک واقعہ کا صحیح صحیح ذکر کر دو۔ پڑھنے والا اُوپر اُٹھتا ہے یا نیچے گرتا ہے اس سے ہمیں کوئی غرض نہیں۔ ہندوستان کہتا ہے، وہ تصنیف تصنیف ہی نہیں جس سے پڑھنے والا ترقّی نہ کرے۔ لیکن اِس امر میں دونوں متفق ہیں کہ کہانی میں کھُلّم کھُلا نصیحت نہ ہونی چاہیئے۔ اس سے کسی کو سبق مل جائے، یہ دُوسری بات ہے، لیکن اس میں صریح طور پر نصیحت نہ کی جائے، جہاں کھُلّم کھُلا نصیحت آئی آرٹ مٹّی میں مِل گیا۔ دَورِ حاضرہ میں کامیاب قصّہ نویس وہ ہے جو گھر کی زندگی کا صحیح چربہ اُتار سکے۔ یاں بیٹھے بیٹھے ہیں تو کیا باتیں کرتے ہیں، خاوند بیوی میں شکر رنجی ہو جاتی ہے تو اُن کے دل میں کیا خیال آتے ہیں ؟ کس طرح دونوں صُلح و صفائی کرنا چاہتے ہیں، لیکن

جھوٹی شرم زبان پکڑ لیتی ہے۔ عالمِ ضعیفی میں بیتے ہوئے عہدِ شباب کی یاد کیونکر آدمی کے دل کو بے قرار کر دیتی ہے؟ ماں اور باپ کی، بیٹی اور بیٹے کی، بہن اور بھائی کی محبت میں کتنا فرق ہے؟ یہ سب ایسے مضامین ہیں جو آجکل کے قصہ نویس کے لئے کہانی کا مواد ہیں۔ بازار کی سیر سے دل کا کنول شگفتہ ہوتا ہے، لیکن جو روحانی مسرت گھر کے اندر ہے وہ باہر کہاں۔ جنگل کا آزاد پرندہ پھول کی ٹہنیوں پر بیٹھ کر کیسا چہچہاتا ہے، اُسے نیلگوں آسمان کی وسیع ختم نہ ہونے والی بلندیوں میں مصروفِ پرواز دیکھ کر ہمارے دل میں بھی جذبات کی باڑھ آجاتی ہے لیکن اُس کے دل کی حقیقی مسرت دیکھنا ہو تو اُس وقت دیکھو جب وہ اپنے بازوؤں کو سمیٹ کر اور معصوم آنکھوں کو نصف بند کر کے نصف کھول کر اپنے گھونسلے میں بیٹھا ہو اور اُسے اس امر کی ذرا پروا نہ ہو کہ باہر کیا ہو رہا ہے؟

دورِ حاضرہ کا افسانہ نویس باہر کا افسانہ نویس نہیں اندر کا افسانہ نویس ہے باہر کو دیکھنے والے بہت ہو چکے، اب دل کو اور گھر کو دیکھنے والوں کی ضرورت ہے باہر کیا ہو رہا ہے، یہ ہر کوئی دیکھتا ہے لیکن گھر اور دل کے اندر کیا کچھ ہو رہا ہے، وہاں داخل ہونا، وہاں کی صورت حال کا مطالعہ کرنا اور پھر اُسے الفاظ میں ظاہر کر دینا آسان نہیں، اور یہی وہ عقدہ ہے جسے حل کرنے کے لئے بیسویں صدی کا افسانہ نویس ادب کی سنگلاخ زمین پر کھڑا ہے

سدرشن

طائرِ خیال کی کہانیوں کی فہرست

طائرِ خیال

عروسِ شاعری

(۱)

مہاراجہ ہرش کا شمار سنسکرت کے اُن شعرائے باکمال میں ہوتا ہے، جن کے نام کو زوال نہیں۔ ہندوستان میں چاند اور سورج کے ساتھ ہرش بھی ہمیشہ زندہ رہے گا۔ لوگ آپ کے تخیّل کی بلندیاں دیکھ کر آج بھی حیرت زدہ رہ جاتے ہیں۔ آپ کا بیشتر حصّہ شعر و شاعری اور تصنیف و تالیف کی نذر ہوتا تھا، آپ کو اُمورِ مملکت کی اتنی پروا نہ تھی جتنی شاعری کی۔ اکثر جوش سے فرمایا کرتے میری حقیقی سلطنت وہ ہے جس پر میرے خیالات کی حکومت ہے۔ یہ بادشاہت چِھن سکتی ہے، بدل

سکتی ہے، تباہ و برباد ہو سکتی ہے، لیکن میری شاعری کی بادشاہت ہمیشہ قائم رہے گی اُسے ظالم موت کی سرد اُنگلیاں بھی ضرر نہیں پہنچا سکتیں آپ عموماً اپنے خیالات میں محو رہتے، اور چاند و سورج، حُسن و شباب، گُل و نغمہ کی لافانی دُنیا کے رنگین خواب دیکھنے میں منہمک رہتے ۔

ایک دن مہاراج باغ میں بیٹھے تھے، شام کا وقت تھا، غروب ہوتے ہوئے سُرخ آفتاب کی زرد شعاعیں گُلاب کے خوش رنگ پھُولوں سے رخصت ہو رہی تھیں، اور اپنی زردی اور افسردگی باغ کے اِن حسین بچّوں کو دیئے جا رہی تھیں، جیسے ہر مہمان عورت اپنی سہیلی کے گھر سے رخصت ہوتے وقت اُس کے بچّوں کو کچھ نہ کچھ دینا لازمی سمجھتی ہے۔ مادرِ گلشن اپنی سہیلیوں کی جُدائی کے تصوّر سے اُداس تھی، اور اُس کے لظر فریب چہرے پر ہجر و ملال کی سیاہ لکیریں بڑھتی جاتی تھیں۔ مہاراج ہرش قُدرت کے اس ہولناک منظر کو دیکھتے تھے اور سپُردِ قلم کرتے جاتے تھے ۔

معاً مہاراج کی کنواری بیٹی، مہ جبیں اُوشا اُن کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی شام کے وقت آفتاب کا ظہور ہُوا، مہاراج اُس وقت عالمِ خیال میں تھے کوئی امیر، کوئی وزیر، سلطنت کا کوئی عظیم سے عظیم حادثہ بھی اُن کی اِس بزمِ خیال میں خلل انداز نہ ہو سکتا تھا، یہ اُن کا شاہی فرمان تھا جس کی حُکم عدولی کرنے کی کسی کی جُرأت نہ تھی۔ لیکن محبّت پر حکومت کے

دروازے بھی بند نہیں، اس کی ہر جگہ رسائی ہے۔ مہاراج نے بادشاہوں کی خفگی سے سر اُٹھایا، مگر اُوشا کو دیکھتے ہی اُن کی خفگی مسکراہٹ میں تبدیل ہوگئی جیسے شمع روشن ہونے پر اندھیرے میں اُجالا ہو جاتا ہے ؛

راجکماری اُوشا نے اپنے شاعر اور بادشاہ باپ کو بیٹی کی پیار بھری نگاہوں سے دیکھا، اور پھر معصومانہ انداز سے مُسکرا کر کہا "آخر میں نے آپ کو ڈھونڈ نکالا۔ میں نے محل کا ایک ایک کونہ، ایک ایک گوشہ تلاش کیا، سنگیت منڈپ میں گئی، چتر بھون میں دیکھا، لیکن آپ ....

یکایک اُس کی نگاہ بھوج پتر پر پڑی۔ اُوشا رُک گئی، اُس نے قدرے محجوب آنکھوں سے مہاراج کی طرف دیکھا اور کہا، پتاجی! مجھے معلوم نہ تھا ورنہ میں ......"

مہاراج نے اس کی معذرت کے الفاظ کو نہ سُنا نہ اُسے فقرہ مکمّل کرنے کی مُہلت دی۔ اُٹھ کر اُس کے قریب آیا، محبّت پدری کا لرزتا ہُوا ہاتھ اُس کے سر پر پھیرا اور جلتی محبّت کے اس پُر سحر عمل کو جاری رکھتے ہوئے بولے "اُوشا بیٹی! ذرا سُورج کی طرف دیکھ! وہ اپنی کرنیں سمیٹ کر مغرب کی سیاہ چادر میں مُنہ چھپا رہا ہے، اس کی کرنیں پھُولوں کے سر پر ہاتھ پھیر رہی ہیں جس طرح میں تیرے سر پر ہاتھ پھیر رہا ہوں، میرے دربار کے شاعر بھی میرے خیال کی نزاکت نہیں سمجھتے، مگر مجھے کامل یقین ہے

کہ تو ضرور سمجھے گی۔ تو میری بیٹی ہے، تیرے دماغ میں میرے دماغ کی تنویر کروٹیں بدل رہی ہے +

مہاراج نے نظم سنائی، اوشا نے نظم سُنی، اور اُس کی آنکھوں کی مُسکراہٹ اور ہونٹوں کی شگفتگی نے مہاراج پر آشکار کر دیا کہ اُس نے نظم کا ایک ایک لفظ سمجھ لیا ہے +

اس کے بعد دونوں باپ بیٹی شام کے اندھیرے میں محل کی جانب روانہ ہوئے، اور اوشا نے باپ کے پیچھے بھاگتے ہوئے عہد طفلی کی سادگی سے کہا "میں بھی شاعری سیکھوں گی"+

اور مہاراج جنہوں نے اس سے قبل اپنی عزیز بیٹی کی ہر ایک چھوٹی سے چھوٹی خواہش کو بھی ہمیشہ پُورا کیا تھا دل میں سوچ رہے تھے۔ اسے شاعری کون سکھائے گا؟ لڑکی جوان ہے اور کنواری ہے، اور حسین ہے، اور دُنیاء نظم میں آسمان خیال کی بلندیوں کو چھونے والے شاعر بھی (عام طور پر) عملی زندگی میں کتنے پست خیال، جذبات حیوانی کے کس قدر غُلام ہوتے ہیں۔ یہ عُریاں صداقت ہرش جیسے بالغ نظر اور باہوش حکمراں سے پوشیدہ نہ تھی +

(۲)

برسات کا موسم تھا، آسمان پر کالی گھٹائیں لہراتی تھیں، جیسے

دلِ مایوس پر اُمید چھائی رہتی ہے۔ کبھی یہ اُمید کے بادل برستے ہیں، کبھی ہوا کے جھونکوں میں منتشر ہو جاتے ہیں، مہاراج ہرش کے دربار میں ایک نوعُمر، خوبصورت ڈنڈی سنیاسی آیا اور بولا "ہم ڈنڈی سنیاسی ہیں، تین دن سے زائد کہیں نہیں ٹھہرتے، لیکن برکھا شروع ہو گئی ہے، اب ہمیں جاترا کرنے کی ممانعت ہے ہم چار ماہ کسی امیر گرہستھی کے ہاں قیام کرنا چاہتے ہیں، کیا تو ہمارا انتظام کر سکتا ہے؟"

مہاراج نے نوجوان سنیاسی کے پاؤں چوم کر پرنام کیا اور بولے:۔ "مہاراج! مَیں اور میری تمام سلطنت شریمان جی کی خدمت کے لئے حاضر ہے۔ مان سرور کے راج ہنس کو پنجرے میں خوش رکھنا آسان نہیں لیکن مَیں اپنی تمام تر قوتیں آپ کو خوش رکھنے کے لئے صرف کر دونگا، اور مجھے اُمید ہے کہ آپ کو بجلی اور بادلوں کے موسم میں شکایت کا موقعہ نہ ملے گا"

سنیاسی نے ہاتھ اُٹھا کر مہاراج کو آشیرواد دی اور کہا "بھگوان تیرا کلیان کریں گے"

سنیاسی کو راج محل میں جگہ مل گئی، جنگل کا باسی شہر میں برکھا کا چوماسہ بسر کرنے لگا۔ مہاراج ہرش جتنا اس کے قریب جاتے تھے ان کے دل میں نوعمر سنیاسی کا وقار بڑھتا جاتا تھا۔ اب انہیں معلوم ہُوا کہ یہ سادھو صرف سادھو نہیں، نہایت چابکدست مصوّر اور بلند مرتبہ شاعر

بھی ہے، اور اتنا ہی نہیں اسے ہر علم میں کمال حاصل تھا، جس جس مضمون پر بولتا ہرش کا مُنہ بند کر دیتا، اس چھوٹی سی عُمر میں دُنیا اور دُنیا کی لذّت کو ترک کر دینا اور پھر ہر علم میں اس قدر قابلیّت بہم پہنچا لینا ایک ایسی بات تھی جو مہاراجہ ہرش کے خواب وخیال میں بھی نہ تھی۔ اور پھر اسکا بشاش چہرہ اور مطمئن آنکھیں جیسے سرسبز و شاداب جنگل میں میٹھے پانی سے لبالب بھرے ہوئے دو تالاب ہوں۔ مہاراج نے سنیاسی کی ہر طرح سے آزمائش کی، اور وہ ہر مرتبہ بے عیب ثابت ہوا، انسانوں میں سیکڑوں نقص ہوتے ہیں۔ سنیاسی میں ایک بھی نہ تھا۔ ایک دن بڑی لجاجت سے بولے "سوامی جی! راجکماری شاعری سیکھنا چاہتی ہے۔ میں نے بہت تلاش کیا۔ مگر ایسا شاعر کوئی نہیں ملا۔ جس پر مجھے پُورا اعتماد ہو . . . . "

سنیاسی نے مہاراج کے نامکمل فقرہ سے مکمل فقرہ کا مفہوم سمجھ کر نہایت سادگی اور بے تکلفی سے جواب دیا "جب تک ہم یہاں ہیں، ہم سکھا دیں گے"۔

مہاراج کے دل کی مُراد پوری ہو گئی، راجکماری شاعری سیکھنے لگی۔

(۳)

چار ماہ کے بعد مہاراج ہرش نے سنیاسی سے پُوچھا۔

"راجکماری اوشا نے کیا کچھ سیکھا؟"

سنیاسی نے من کو موہ لینے والی موٹی موٹی اور روشن آنکھوں سے مہاراج کی طرف دیکھا، اور نہایت ہی دلکش انداز سے مُسکرا کر جواب دیا "شاعر باپ کی بیٹی ہے، بہت کچھ سیکھ چکی۔ اِس قدر کم مدّت میں کوئی دُوسرا آدمی کچھ بھی نہ سیکھ سکتا، مگر راجکماری کی شاعری دیکھ کر خود ہم بھی دنگ رہ جاتے ہیں۔ نہایت باکمال شاعرہ ہے"۔

مہاراج کو تعجّب ہُوا، "لیکن صرف چار ماہ کے عرصہ میں؟"

سنیاسی نے مہاراج کی طرف اِس طرح دیکھا جس طرح گورو اپنے کم سمجھ نادان شاگرد کی طرف دیکھتا ہے اور تب شیریں لہجہ میں جواب دیا۔ "مہاراج! شاعر بنتے نہیں ہیں، شاعر پیدا ہوتے ہیں۔ ان میں یہ قابلیّت از خود موجود ہوتی ہے جس طرح آگ کے دہکتے ہوئے شُعلے راکھ تلے سوئے رہتے ہیں، گورو کا کام صرف یہ ہے کہ راکھ کو ہٹا دے شُعلے اپنے آپ بلند ہوں گے۔ ہوا کے جھونکے ہی ان کے لئے گھی کے چھینٹے بن جائیں گے۔ راجکماری میں یہ قوّتیں پہلے ہی سے موجود تھیں، ہم نے انہیں صرف بیدار کر دیا ہے —— اور اب وہ حسین لفظوں اور حسین خیالوں کے علم کی پُوری ماہر ہے"۔

مہاراج نے مسرّت، فخر اور استعجاب سے اپنی بیٹی کی طرف دیکھا وہ زمین کی طرف دیکھ رہی تھی، زمین کی طرف ہی دیکھتی رہی شرم نے

اُسے سر نہ اُٹھانے دیا ÷

"اوشا"

راجکماری نے بصد مُشکل سر اُٹھا کر باپ کی طرف دیکھا اور شرما کر گردن جھکالی ÷

"اپنی کوئی نظم سُناؤ، سناؤ گی نا؟"

راجکماری نے اسی طرح زمین کی طرف دیکھتے ہوئے سر کی جُنبش سے جواب دیا "نہ"

"کیوں؟"

راجکماری نے جواب نہ دیا ÷

"سُناؤ بیٹی۔ کوئی عمدہ سی نظم، اس میں شرمانے کی کیا بات ہے؟"

راجکماری نے سر کی ساڑھی ماتھے پر کھینچتے ہوئے آہستہ سے کہا "آپ کو میری نظم کیا پسند آئے گی؟"

اب سنیاسی خاموش نہ رہ سکا، مُسکرا کر بولا "اوشا دیوی! یہ تمہارا ہی امتحان نہیں ہے۔ میرا بھی امتحان ہے۔ دیکھنا! گورو کے دعوے کی لاج رہ جائے" ÷

اوشا نے اپنی کاپی کے ورق اُلٹ پلٹ کر دیکھا، لیکن طے نہ کرسکی کہ کیا سنائے۔ بے بسی سے بولی "کیا سُناؤں کچھ سمجھ میں نہیں آتا" ÷

"کوئی نظم سنا دو۔ مصری ہر طرف سے میٹھی ہوتی ہے"۔

اوشا نے ہمّت کر کے نظم سنانے کا تصفیہ کیا اور کہا "عروسِ شاعری پر کچھ خیالات موزون کئے ہیں وہی سنائے دیتی ہوں"۔

اس نے کئی دفعہ بولنا چاہا، لیکن اس کے الفاظ اس کے ہونٹوں پر منجمد ہو گئے، اور اس کی آواز اس کے حلق میں پھنس گئی۔ مہاراج نے اس فطری حیا کو محسوس کر کے کہا "آپ ہی پڑھ دیں، اس سے نہ پڑھا جائے گا"۔

سنیاسی نے نظم ہاتھ میں لی، راجکماری اُٹھ کر بھاگ گئی، مہاراج نے اس کی طرف محبّت بھری نگاہوں سے دیکھا، اور سنیاسی سے کہا، فرمائیے!

سنیاسی نے پڑھنا شروع کیا:۔

شاعری کو شاعر سے وہی نسبت ہے، جو نئی بیاہی ہوئی عورت کو اپنے شوہر سے ہے۔ شوہر بیوی کو چھُونا، پکڑنا ہمکنار کرنا چاہتا ہے، لیکن نئی بیاہی ہوئی بیوی لجاتی ہے، اپنا جسم چراتی ہے، اور بچ کر ایک طرف بھاگ جاتی ہے۔ عروسِ شاعری کی بھی یہی کیفیّت ہے۔ وہ کبھی شاعر کے سامنے فرمانبردار غلام کے مانند سر جھکا کر کھڑی ہو جاتی ہے، کبھی اس کی طرف دیکھ کر سرکش لڑکے کی

طرح ہنستی ہے، کبھی حیا سے مُنہ چھپا لیتی ہے، اور کبھی
جب شاعر اس کے بہت قریب پہنچ جاتا ہے تو چنچل
ہرن کی طرح قلانچیں بھر کر دُور چلی جاتی ہے۔ کبھی
ذرا سی بات میں گردن جُھکا لیتی ہے کبھی بے حجابانہ
اپنی دونوں باہیں اس کے گلے کے گرد حمائل کر دیتی
ہے"۔

یہ نظم کیسی لطیف تھی، کیسی دلنواز اور اس کے ساتھ ہی کس قدر سادہ، اس میں پیچیدگی نہ تھی نہ کوئی ایسی بات تھی جس کے سمجھنے کے لئے گھنٹوں پریشان ہونا پڑے، خیال اچھا بھی تھا، بلند بھی تھا، لیکن خلاف قُدرت نہ تھا۔ کسی دُوسرے شاعر کے مُنہ سے یہی نظم سُن کر مہاراج وجد میں آجاتے، اور اُسے انعام و اکرام سے مالا مال کر دیتے، لیکن اپنی بیٹی کا لکھا ہُوا حُسن و عشق کا یہ نادر افسانہ سُن کر اُن کی آنکھوں میں خُون اُتر آیا، سوچنے لگے، یہ کنواری لڑکی! خاوند بیوی کے راز و نیاز کیا جانے؟ اس نے یہ محبّت کا منظر کب اور کہاں دیکھا۔ اُن کے دل میں ایک شُبہ نے سر اُٹھایا ان کا لہو کھولنے لگا، انہوں نے سنیاسی کی طرف چُبھتی ہوئی نگاہوں سے دیکھا اور صُورت حال کو بھانپنے کی کوشش کی۔ خیال آیا کیا سونا بھی آگ میں پڑ کر کھوٹا ہو گیا لیکن

نوعمر سنیاسی ہنس رہا تھا، اس کے چہرے پر ذرا فکر، اس کی آنکھوں میں ذرا خوف نہ تھا، مہاراج تذبذب میں پڑ گئے، یہ چہرہ گنہگار کا چہرہ نہ تھا، گناہ ٹیڑھی آنکھ کے سامنے سر نہیں اُٹھا سکتا، نہ اس میں بروقت امتحان مسکرانے کی جرأت ہوتی ہے، لیکن اوشا نے عورت مرد کی محبت کی نظم کیسے لکھی؟ یہ خیال اس کے ذہن میں کیسے آیا؟

مہاراج کچھ دیر عالمِ تحیّر میں بیٹھے رہے، پھر آہستہ سے اُٹھ کر چُپ چاپ چلے گئے، اس وقت ان کے دل میں جیسے آتش فشاں پہاڑ پھٹ گیا۔ سنیاسی سب کچھ سمجھ گیا:۔

(۴)

دُوسرے دن مہاراج نے سنیاسی کو وداع کرنے کے لئے دربار میں بُلایا، اشرفیوں سے بھرا ہُوا تھال اُن کی نذر کیا، اور کہا یہ "آپ کی دکشنا ہے":۔

سنیاسی نے اشرفیوں کے تھال کو بے پروائی کی نگاہ سے دیکھ کر زمین پر رکھ دیا اور کہا "راجن! تو راجوں میں شاعر اور شاعروں میں راجہ ہے، یہ دکشنا تیری شان کے شایان نہیں":۔

مہاراج نے حیرت سے سنیاسی کی طرف دیکھا مگر سنیاسی کا چہرہ مطمئن تھا "ہم مُنہ مانگی دکشنا چاہتے ہیں":۔

مہاراج نے پھر سنیاسی کے چہرے کی طرف دیکھا، مگر وہاں کوئی پریشانی، کوئی گھبراہٹ نہ تھی۔ یہ دیکھ کر مہاراج نے کچھ سوچا اور اس کے بعد عجز سے سر جھکا کر کہا "حکم کیجئے، میں تعمیل کروں گا"۔

تمام درباری حیرت سے تک رہے تھے کہ دیکھیں تو عمر سنیاسی کیا مانگتا ہے؟

سنیاسی نے کہا "ہمیں اپنی کوئی تازہ نظم سنا دے، عمدہ نظم کی قیمت دنیا بھر کے خزانے بھی نہیں ہیں۔

درباریوں نے دل میں کہا، "سنیاسی پاگل ہے"۔

مہاراج نے پوچھا "کس مضمون پر؟

"کسی غریب کے گھر کا منظر ہو"۔

مہاراج نے بھوج پتر لیا، اور ایک طرف بیٹھ گئے، آدھ گھنٹے کے بعد نظم تیار تھی۔

"پڑھو"۔

مہاراج نے پڑھنا شروع کیا۔

"برکھا کا موسم ہے، آسمان پر سیاہ بادل اُمڈے ہوئے ہیں، مگر ان سے بھی تاریک بادل غریب بڑھیا کے دلِ غمزدہ پر چھائے ہوئے ہیں۔ آسمان کے

بادلوں میں کبھی کبھی بجلی چمک جاتی ہے، مگر اس کے دل کے بادل سدا تاریک رہتے ہیں۔

چھت سے پانی ٹپک رہا ہے، اور اس متواتر ٹپکے سے بڑھیا کے کچے فرش میں جا بجا گڑھے بن گئے ہیں پانی کی بوندیں ان گڑھوں میں گرتی ہیں تو گڑھوں کا پانی چاروں طرف اُڑتا ہے، اور آس پاس کے فرش کو بھی گیلا کر دیتا ہے۔ مگر ان گڑھوں سے بھی گہرے گڑھے بڑھیا کے دل میں بنے ہوئے ہیں۔

شام کی تاریکی بڑھ رہی ہے، لوگ اپنے اپنے مکانوں میں چراغ جلا رہے ہیں لیکن بڑھیا کے چراغ کا تیل کئی دن سے ختم ہو چکا ہے اور اس کی بتی اس کے سر کے رُوکھے سُوکھے بالوں کے مانند خشک ہے۔

اس کا گھر شمشان کی طرح اُداس اور بھیانک ہے اس کے چولہے میں کئی دن سے آگ نہیں جلی، اور اس میں مکڑی نے جالے تن دیئے ہیں، اُس کے گھر کے چوہے اپنے بل چھوڑ کر بھاگ گئے ہیں، اور چمگادڑ تاریکی میں اِدھر اُدھر اُڑتے پھرتے ہیں۔

یہ نظم نہیں تھی، کسی مفلس کے گھر کی ہو بہو تصویر تھی۔ لیکن کتنی دردناک، کیسی موثر، درباریوں نے واہ واہ کے فلک شگاف نعرے بلند کئے لیکن نوعمر سنیاسی خاموش تھا *

مہاراج نے استفسار بھری نگاہوں سے سنیاسی کی طرف دیکھا۔ گویا زبان حال سے پوچھا، "کیوں کیسی رہی؟"

سنیاسی نے کہا "یہ نظم واقعی بہت بڑھیا ہے، مگر......"

درباری، وزیر، مہاراج سب سنیاسی کی طرف دیکھ رہے تھے، سنیاسی نے کہا "یہ معلوم ہوتا ہے، تو راجہ کا بیٹا نہیں ہے، کسی غریب کنگال کا لڑکا ہے"*

درباری سناٹے میں آگئے، مہاراج کا چہرہ کانوں تک سُرخ ہو گیا، اُنھوں نے تلوار کی میان پر ہاتھ رکھ کر کہا:-

"سنیاسی! مَیں راجہ ہوں، مَیں یہ توہین کبھی برداشت نہ کروں گا"*

"اگر تُو راجے کا بیٹا ہے تو تُو نے یہ نظم کیسے کہی، تُو راجہ ہے تو غریب کے گھر کا حال کیا جانے؟"

مہاراج نے اسی طرح غصہ سے جواب دیا "شاعر عالمِ خیال میں وہ دیکھ سکتا ہے جو دُوسرے لوگ کھُلی آنکھوں سے بھی نہیں دیکھ سکتے"*

نوعُمر سنیاسی نے بُوڑھوں کی سی سنجیدگی سے جواب دیا:-

"راجہ! تُو نے ٹھیک کہا ہے، لیکن اگر تُو راجہ ہو کر عالمِ خیال میں غریب کے گھر کا نقشہ دیکھ سکتا ہے۔ تو تیری بیٹی مرد عورت کی محبت کا حال کیوں نہیں جان سکتی۔ تُو نے مجھے شک کی نگاہوں سے دیکھا تھا۔ تیری آنکھیں لال ہو گئی تھیں، تُو نے سمجھا تھا، سنیاسی کو بھی اپنے جذبات پر قابو نہیں، لیکن تیرا شُبہ بے بُنیاد تھا۔ میں سنیاسی ہوں، دُنیا کی ہر ایک لڑکی میری بیٹی ہے"۔

یہ کہتے کہتے سنیاسی نے اپنا کمنڈل اُٹھایا۔ اور دربار سے چلا گیا۔ مہاراج کی آنکھیں کُھل گئیں، لیکن ان کی زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔

گورو منتر

(۱)

آدھی رات کے وقت نوجوان ایکناتھ نے نہایت آہستگی سے اپنے مکان کا دروازہ کھولا اور باہر نکل آیا۔ گلی، بازار، گاؤں سب سُنسان اور تاریک تھے۔ ایکناتھ نے ایک لمحہ کے لئے رُک کر اپنے مکان کی طرف پُرشوق نگاہوں سے دیکھا، اپنے ضعیف دادا اور دادی کا خیال کیا، اپنے یار دوستوں کے متعلّق سوچا اور اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے لیکن یہ پست ہمتّی چند ہی لمحوں کے لئے تھی جیسے بعض وقت طائر پر پرواز کھولتے کھولتے رُک جاتا ہے، یکایک اُس نے آنسو پونچھ ڈالے اور جلد جلد قدم اُٹھاتا ہُوا گاؤں سے باہر چلا گیا۔ پنجرے میں دانا پانی سبھی کچھ تھا لیکن پنچھی نے کسی کا بھی خیال نہ کیا اور اُڑ گیا۔ چاروں طرف بھیانک تاریکی تھی۔ دُور فاصلے پر درختوں کے سیاہ

سایہ تلے کُتّوں اور گیدڑوں کی مدھم آوازیں سُنائی دیتی تھیں۔ گھر میں بُوڑھے والدین کی محبت آہ وزاری کر رہی تھی مگر اکینا تھ آہنی استقلال سے جھاڑیوں میں اُلجھتا ہُوا، گڑھوں میں گرتا ہُوا، اندھیرے میں پتھروں سے ٹھوکریں کھاتا ہُوا آگے بڑھتا چلا جاتا تھا اور اُسے اِس امر کی ذرا بھی پروا نہ تھی کہ راستہ خطرناک ہے اور شب کی تاریکی میں بلائیں پوشیدہ ہو سکتی ہیں +

صُبح کے وقت جب اُس کے بُوڑھے دادا اور دادی کے دلخراش نالوں سے گاؤں بھر میں کہرام مچا ہُوا تھا، وہ کئی کوس کا فاصلہ طے کر چکا تھا، اور ایک ندی کے کنارے بیٹھا اپنے پاؤں دھو رہا تھا، جنہیں جنگل کے کانٹوں نے مجروح کر دیا تھا، اُس کا جسم شب بیداری اور سفر سے چُور چُور ہو رہا تھا لیکن اُس کے خیالات امیدوں کے آسمان میں اُڑے چلے جاتے تھے جنہیں روکنے کی طاقت زمین کی کسی چیز میں نہ تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ اُٹھا اور اپنے گاؤں کی طرف مُنہ کر کے کھڑا ہو گیا، اُس وقت وہ اپنے گھر کی حالت کا تصوّر کر رہا تھا اور اُس کے مناظر تخیّل کی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا، ہم گھر چھوڑ سکتے ہیں لیکن اُس کی محبت کو دل سے بھلا دینا آسان نہیں +

اتنے میں ایک مُسافر گھوڑے پر سوار اُدھر سے گزرا اور اکینا تھ کے

پاس پہنچ کر رُک گیا۔ ایکناتھ نے دونوں ہاتھ باندھ کر نمسکار کیا ٭
مُسافر نے دُعا دی اور پُوچھا "کہاں جاؤ گے"؟
ایکناتھ نے اپنے گاؤں کی طرف پیٹھ کر لی اور اپنے سامنے پھیلے ہوئے وسیع جنگل کی طرف اشارہ کر کے جواب دیا "بہت دُور" ٭
مُسافر۔ مگر کہاں؟
ایکناتھ۔ گورو کے چرنوں میں ٭
مسافر گھوڑے سے اُتر آیا اور ایکناتھ کے کندھے پر شفقت سے ہاتھ رکھ کر بولا "تمہارا گورو کون ہے"؟
ایکناتھ "پنڈت جناردن پنت"٭
یہ کہہ کر ایکناتھ نے دونوں ہاتھ باندھ کر عالمِ خیال میں گورو کو نمسکار کیا اور سر جُھکا دیا، جیسے وہ فی الحقیقت گورو کے سامنے کھڑا ہو۔ مسافر کو ایکناتھ کی عقیدت پر تعجب ہوا "کون جناردن پنت؟ جو دیوگدھ کے دیوان ہیں"٭
ایکناتھ "جی ہاں! وہی جن کا آج کل دُور دُور تک ثانی نہیں ہے، کیا آپ نے اُن کے درشن کئے ہیں"؟
مُسافر "کئی مرتبہ، مگر وہ تو کسی کو گورو منتر نہیں دیتے۔ میں نے اُن کے یہاں کوئی چیلا نہیں دیکھا۔ حیرت ہے کہ اُنہوں نے تمہارے جیسے

نوجوان کو اپنا چیلا کیسے بنا لیا"۔

ایکناتھ۔ "(اُداس ہوکر) اُنہوں نے مجھے اپنا چیلا نہیں بنایا"۔

مسافر۔ "ارے!"

ایکناتھ۔ "مگر میں نے اُنہیں اپنا گرو بنا لیا، اب جاکر قدموں سے لپٹ جاؤں گا دیکھتا ہوں کیسے کرپا نہیں کرتے؟"

مُسافر۔ "تمہاری عمر بہت کم ہے"۔

ایکناتھ۔ "سمجھدار کے لئے کم بھی بہت ہے"۔

مُسافر۔ "تمہیں دُنیا کا تجربہ ہے"۔

ایکناتھ۔ "گورو جی مہاراج کی نگاہِ کرم ہو جائے تو تجربہ بھی ہو جائیگا"۔

مُسافر۔ "یہ رستہ بڑا کٹھن ہے"۔

ایکناتھ۔ "ہمت ہو تو سب مُشکلیں آسان ہو جاتی ہیں"۔

مُسافر۔ "مگر دیو گڑھ تک کیسے پہنچو گے، بڑی دُور ہے"۔

ایکناتھ۔ "جن کے دل کو لگی ہو۔ اُن کے لئے فاصلہ کوئی معنی نہیں رکھتا"۔

مُسافر۔ "کوئی گھوڑا کیوں نہیں لے لیتے"۔

ایکناتھ۔ "گورو جی کے پاس ننگے پاؤں جانا چاہیئے"۔

مسافر نے یہ باتیں سُنیں تو بہت خوش ہُوا، اُس نے ایک دُنیا دیکھی تھی مگر ایسا نوجوان اُس کی نگاہ سے آج تک نہ گزرا تھا۔ یہ نوجوان نہ

تھا عقیدت اور ہمّت کی جیتی جاگتی تصویر تھی۔ اُس نے ایکناتھ کو محبّت کی نظر سے دیکھا اور گھوڑے پر سوار ہو کر اپنی راہ چلا گیا۔

(۲)

کتنی تکلیفوں، کتنی مصیبتوں اور کتنی جانکاہیوں کے بعد نوجوان ایکناتھ دیوگڑھ پہنچا۔ اس کا اندازہ لگانا آسان نہیں، لیکن دیوگڑھ پہنچ کر ایکناتھ کی تمام کلفتیں رفع ہو گئیں۔ پیاسا ہرن پانی کی تلاش میں کتنا دوڑتا ہے کیسا پریشان ہوتا ہے۔ اُس کا جسم تکان سے کس طرح چُور چُور ہو جاتا ہے لیکن پانی کے چشمۂ شیریں کے قریب پہنچ کر اُس کی ساری تکان جاتی رہتی ہے اور وہ آنِ واحد میں تازہ دم ہو جاتا ہے ایکناتھ کی بھی یہی حالت تھی۔ وہ اب گورو کی نگری میں آ پہنچا تھا۔ وہ جنّتی خوابوں کی سرزمین میں پہنچ چکا تھا۔

تیسرے پہر کا وقت تھا، ایکناتھ پنڈت جنارون پنت کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اُس وقت پنڈت جی سرکاری کاغذات دیکھنے میں ہمہ تن محو تھے ایکناتھ چُپ چاپ ایک کونے میں کھڑا ہو گیا اور عقیدتمندانہ انداز سے اپنے گورو کی طرف دیکھنے لگا "یہی وہ شخص ہے جو دُنیا میں رہتے ہوئے بھی دُنیا کی آلائشوں سے پاک صاف ہے جو گھر بار والا ہوتے ہوئے بھی اپنے عہد کا سب سے بڑا عابد مرتاض ہے جو صرف ریاست دیوگڑھ کا دیوان

ہی نہیں بہادر سپاہی زبردست جرنیل اور نہایت قابل ریاضی دان بھی ہے جس کا ہندو مسلمان دونوں احترام کرتے ہیں جس کے سامنے سر اٹھانے کی بادشاہ کو بھی مجال نہیں۔" ایکناتھ کے دل و دماغ پر فخر و مسرّت کی وجدانی کیفیّت طاری ہوگئی، اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ یکایک پنڈت جی نے سر اُٹھایا اور ایکناتھ کی طرف دیکھا۔ ایکناتھ کے جسم میں بجلی کی لہر دوڑ گئی۔ یہ تو وہی مُسافر تھا جو ایکناتھ کو اپنے گاؤں کے قریب ملا تھا جو مُسکرا مُسکرا کر باتیں کرتا تھا جس کی آنکھوں میں من کو موہ لینے والی طاقت تھی ایکناتھ دوڑ کر آگے بڑھا اور پنڈت جی کے چرنوں سے لپٹ گیا۔ اُس وقت اُس کے آنسو پنڈت جی کے پاؤں پر گر رہے تھے، مگر یہ آنسو معمولی آنسو نہ تھے ایکناتھ کا پریم تھا جو گورو کے چرنوں پر قربان ہو رہا تھا یہ اُس کی عقیدت تھی جو اپنے دیوتا گورو جھانے کے لئے خانۂ دل سے نکلی تھی،

پنڈت جی نے ایکناتھ کو اپنے پاؤں پر سے اُٹھایا اور سنگ دل سے سنگ دل آدمی کو بھی بس میں کر لینے والے انداز سے مُسکرا کر پوچھا،

"آخر کار تم یہاں آ گئے، مگر بہت تکلیف پائی"؟

ایکناتھ نے پنڈت جی کے پاؤں کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا،

آپ کے درشن کرکے ساری تکلیف بھول گیا"۔

پنڈت جی "تو اب کیا ارادہ ہے"؟

ایکناتھ :- "آپ سب کچھ جانتے ہیں، مَیں کیا کہوں"۔

پنڈت جی :- "گورو منتر چاہتے ہو؟"

ایکناتھ :- "یہ میری زندگی کا سب سے بڑا خواب ہے"۔

پنڈت جی :- "مَیں معمولی گرہستی ہوں مجھ سے تمہارا کیا بھلا ہو گا۔ کسی پرم ہنس کے پاؤں کیوں نہیں پکڑتے کہ بیڑا پار ہو جائے"۔

ایکناتھ :- "مَیں نے سب سے بڑا پرم ہنس چُن لیا اب اور کہاں جاؤں گا۔ آپ گرہستی ہیں لیکن آپ کا درجہ سادھو سنیاسیوں سے بھی بلند ہے"۔

پنڈت جی :- "یہ تمہارا خیال ہے مَیں تو بادشاہ کا ایک ادنیٰ مُلازم ہوں"۔

ایکناتھ۔ "لیکن میرے لئے آپ بادشاہوں کے بھی بادشاہ ہیں، اب مایوس نہ کیجئے، بڑی دُور سے آیا ہوں۔ یہ کہہ کر ایکناتھ پھر جھکا اور پنڈت جی کے پاؤں سے لپٹ گیا۔ پنڈت جی لاجواب ہو گئے۔ انکسار اور محبّت کے سامنے منطق و دلیل کی بھی پیش نہیں جاتی۔ دیو گرھ کا دیوان ایک سادہ لوح نوجوان کے سامنے چُپ تھا اور نہ جانتا تھا کہ اُس کا کیا جواب دے۔ آخر اُنہوں نے اُسے پھر اُٹھایا اور کہا۔ "دیکھو ہمیں گورو منتر دینے میں اعتراض نہیں لیکن اُس کے لئے تمہیں اپنے آپ کو مُستحق ثابت کرنا ہو گا کہو امتحان دینے کو تیار رہو؟" ایکناتھ خودداری

کے انداز سے تن کر کھڑا ہو گیا مگر فوراً مؤدبانہ طرز سے سر جھکا کر بولا:۔

"جی ہاں بڑی خوشی سے"۔

یہ کہہ کر اُس نے گورو کے پاؤں کی مٹّی اُٹھائی اور اپنی پیشانی پر مل لی۔ گویا یہ مٹّی مٹّی نہ تھی چندن کا براوہ تھا۔

(۳)

تین سال گزر گئے، ایکناتھ نے گوروجی کی خدمت میں دن رات ایک کر دیا، ایسی تن دہی سے کسی غلام نے اپنے آقا کی بھی خدمت کم کی ہو گی۔ وہ گوروجی کے کپڑے دھوتا، اُن کے لئے دھان کوٹتا، پانی بھرتا، بچّوں کو کھلاتا اور یہی نہیں اُن کے دفتر کا سارا کام اپنے ہاتھ سے کرتا۔ گوروجی اب کاغذوں کو دیکھتے بھی نہ تھے، سارا سیاہ و سفید ایکناتھ کے ہاتھ میں تھا۔ ریاست کے لوگ اُس کی خداداد قابلیّت پر عش عش کرتے تھے یہاں تک کہ بادشاہ بھی اُس کا مدّاح تھا، مگر ایکناتھ اس تعریف و ثنا سے مغرور نہیں ہُوا نہ اُسے کبھی خیال آیا کہ مَیں بھی کسی شمار میں ہُوں۔ وہ صرف یہ چاہتا تھا کہ گوروجی امتحان لے رہے ہیں۔ کامیابی ہوئی تو جنم مرن کے پھندے سے آزاد ہو جاؤں گا۔

صُبح کا وقت تھا پنڈت جی اپنے مندر میں بیٹھے ایشور کا بھجن کر رہے تھے اور ایکناتھ باہر کھڑا تھا کہ کوئی آ کر مخل نہ ہو۔ اتنے میں گھوڑے کی

ٹاپوں کی آواز سُنائی دی۔ ایکناتھ ڈر گیا اُسے اندیشہ ہُوا کہ کہیں یہ آوازیں گورو جی کے ایشور بھجن میں مخل نہ ہوں۔ ان کا دھیان ہٹ گیا تو مُنہ دکھانے کے قابل نہ رہوں گا۔ وہ جلدی سے باہر نکلا کہ سوار کو صُورت حال سے آگاہ کرے۔ لیکن یہ سوار کوئی راہ گیر مُسافر نہ تھا شاہی سوار تھا جو بادشاہ کا خاص پروانہ لے کر آیا تھا۔ ایکناتھ نے آگے بڑھ کر اُسے روک دیا اور آہستگی سے کہا۔ گورو جی بھجن کر رہے ہیں، گھوڑے سے اُتر آؤ۔

سوار گھوڑے سے اُتر پڑا اور جیب سے ایک سر بمہر لفافہ نکال کر بولا "شاہی پروانہ ہے، ابھی دیوان جی کے پاس پہنچا دو"۔

ایکناتھ "مگر وہ تو سمادھی میں ہیں"۔

سوار "کوئی پروا نہیں اُٹھا دو"۔

ایکناتھ "یہ تو مشکل ہے۔ کیا بہت ضروری کام ہے؟"

سوار "اب میں تم سے کیا کہوں ضروری ہے کہ نہیں۔ جہاں پناہ کا حکم ہے، اسی وقت پہنچاؤ۔ ورنہ میں پاگل نہ تھا جو تم سے بحث کرتا"۔

ایکناتھ نے کاغذ کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا اور پُوچھا مگر ایسی کون سی ضروری بات ہے جو ذرا بھی انتظار نہیں کر سکتے؟

سوار "واللہ اعلم، میرا کام حکم کی تعمیل کرنا ہے۔ اب تم جا کر اطلاع کرتے ہو یا میں خود جاؤں۔ بہر حال یہ پروانہ اُن کے پاس پہنچنا چاہیئے

اور اسی وقت - ذرا سی دیر بھی ریاست بھر کے لئے ....."
ایکناتھ وہ اُن کے پاس اِس وقت کوئی نہیں جا سکتا - یہاں تک کہ اگر بادشاہ سلامت آجائیں تو اُن کو بھی باہر ہی رُکنا پڑے گا"

سوار نے کچھ دیر تک کچھ سوچا اور اس کے بعد آہستہ سے کہا کہ مَیں تم سے صاف ہی کیوں نہ کہہ دوں - شہر پر کسی دشمن نے حملہ کیا ہے بادشاہ سلامت یہ پروانہ بھیج کر اپنے فرض سے سبکدوش ہو گئے شہر بچے یا برباد ہو اُن کی بلا سے، اور کسی کو اس کی فکر نہیں - لے دیکے ایک دیوان صاحب ہیں جن کو شہر کی حفاظت کا خیال ہے - اور جن کے اشارہ پر ایک ایک سپاہی مر کٹنے کو تیار ہے، اب تُم ہی سوچ لو کہ اُن کو اِسی وقت اطلاع کرنی مناسب ہے یا نہیں - مگر میں اتنا کہے دیتا ہوں کہ اگر اُن کو اطلاع نہ ہوئی تو دشمن قلعہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دے گا +

یہ کہہ کر سوار چلا گیا مگر اُس کے لفظ ایکناتھ کے کانوں میں گونج رہے تھے - اُس نے پروانہ دیوان صاحب کے ضروری کاغذات میں رکھ دیا اور گھٹنوں پر سر رکھ کر سوچنے لگا کہ کیا کرنا چاہئیے، گوروجی کو اُٹھاؤں یا نہ اُٹھاؤں، سمادھی میں ہیں، بادشاہوں کے بادشاہ کے دربار میں ہیں، کہیں ناراض نہ ہو جائیں، غُصّہ نہ آجائے

اور سب کئے کرائے پر پانی پھر جائے۔ ایک دن فرماتے تھے پرماتما اپنے بھگتوں کے کام خود کر دیتے ہیں۔ کہیں گے یہ سبق تو نے کیسے بھلا دیا، شرمندہ ہو جاؤں گا، جواب نہ دے سکوں گا، اُن کے سامنے سر نہ اُٹھا سکوں گا تو ٹھیک ہے، مجھے اُن کو نہ اُٹھانا چاہیئے، دیکھوں پھر وہ غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے۔

ایکناتھ بے فکر سا ہو گیا اور صحن میں ٹہلنے لگا۔ مگر فکر شہد کی مکھی کی مانند ہے اسے جتنا ہٹاؤ اُتنا ہی اور چمٹتی ہے۔ ایکناتھ کو پھر اسی خیال نے آگھیرا، کہیں دُشمن قریب ہی نہ ہو۔ بادشاہ نے ایسا ضروری پروانہ کبھی نہیں بھیجا، ضرور دُشمن قریب آچکا ہوگا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں اُن کی حفاظت ہی کرتا رہ جاؤں اور شہر پر دُشمن کا قبضہ ہو جائے اُس وقت گورو جی کے دل کی کیا حالت ہوگی۔ بہت خفا ہوں گے، کہیں گے تجھے اتنی بھی تمیز نہیں کہ وقت بیوقت پہچان سکے۔ ہم سمادھی میں بیٹھے رہے، اُدھر شہر کی صفائی ہو گئی اس کا ذمہ دار تو ہے جس نے ایسی حماقت کی، ایکناتھ تذبذب کی حالت میں تھا، کبھی سوچتا اُٹھا دینا چاہیئے وقت کا یہی تقاضا ہے، کبھی سوچتا نہیں اُٹھانا چاہیئے خفا ہو جائیں گے۔ وہ دونوں طرف دیکھتا تھا، مگر اُسے دونوں طرف تاریکی نظر آتی تھی کہیں بھی روشنی نہ تھی۔ وہ پس و پیش کے عالم

میں اِدھر اُدھر پھر رہا تھا۔ اُس کی ایسی حالت آج تک کبھی نہ ہوئی تھی۔ اپنے اردگرد سیاہ سانپوں کو پھنکاریں مارتے دیکھ کر بھی اُس کا حوصلہ پست نہ ہوتا مگر اس وقت وہ بیحد پریشان تھا، اُس کی پیشانی سے پسینہ کے قطرے ٹپک رہے تھے، اُس کے چہرہ کا رنگ لمحہ بہ لمحہ متغیر ہو رہا تھا، جیسے یہ اُس کی زندگی اور موت کا سوال تھا۔ اس وقت اس کو کون بچا سکتا ہے۔ اس ناامیدی کے دریا سے کون اُس کی بانہہ پکڑ کر پار لگا سکتا ہے، سوا گرد کے اور کوئی نہیں۔ اور گوروجی (اُس نے اُن کی طرف دیکھا) ابھی تک اسی طرح آنکھیں بند کئے بیٹھے تھے۔ ایکناتھ زمین پر گر پڑا اور پھوٹ پھوٹ کر رو دیا لیکن اُس سے کچھ حاصل نہ ہوا، وقت تیزی سے اُڑا چلا جا رہا تھا ؛

اتنے میں قلعہ کے باہر دشمن کی توپیں گرجنے لگیں، ایکناتھ کا زرد چہرہ اور بھی زرد ہو گیا، سوچنے کا وقت نہ تھا کام کرنے کا وقت تھا ایک لمحہ میں اِدھر یا اُدھر۔ ایکناتھ نے اپنے دھڑکتے ہوئے دل پر ہاتھ رکھا، اپنے غور و فکر کی قوّت کو یکجا کیا۔ ایک منٹ کے لئے سر جھکایا اور فیصلہ کر لیا۔ دس منٹ بعد وہ گوروجی کا جنگی لباس پہنے اُن کے جنگی گھوڑے پر سوار تھا اور دیوگڈھ کے سپاہی اُس کے پیچھے "بم بم مہادیو" کہتے ہوئے قلعہ کے دروازے سے باہر نکل رہے تھے۔ ایکناتھ

لڑا اور فتحیاب ہُوا، اور دُشمن کو بھگا کر واپس آ گیا۔ لیکن اُس وقت یہ کسی کو بھی علم نہ ہُوا کہ یہ ایکناتھ ہے پنت جی نہیں ہیں، ایکناتھ نے جلدی سے گھوڑا اصطبل میں باندھ دیا، زرہ بکتر اُتاری اور اپنے زرد رنگ کے کپڑے پہن کر چُپ چاپ اپنی جگہ پر آ بیٹھا جیسے کچھ ہُوا ہی نہیں ؛؛

(۴)

تھوڑی دیر کے بعد گورو جی کی سمادھی کھُلی اور وُہ باہر نکلے۔ وہاں ہر ایک کی زبان پر اسی واقعہ کا ذکر تھا، لوگ کہتے تھے آج دیوان صاحب نے کمال کیا، اُن کی تلوار اِس طرح چلتی تھی جیسے قینچی کپڑے پر چلتی ہے، دُشمن کس طمطراق سے آیا تھا گویا دیوگڑھ میں سپاہی نہیں بستے جانور بستے ہیں۔ لیکن دیوان صاحب نے اُن کے دانت کھٹے کر دیئے۔ دیوان صاحب حیران تھے کہ یہ کہتے کیا ہیں، کون آیا، کس نے حملہ کیا، کس نے دانت کھٹے کئے اُن کو کسی بات کا بھی علم نہ تھا۔ اِسی حیرت میں آگے بڑھے چلے جاتے تھے کہ ایک جگہ چند آدمی کچھ باتیں کرتے نظر آئے، دیوان صاحب اُن کے پیچھے کھڑے ہو گئے اور سُننے لگے ؛؛

ایک آدمی کہہ رہا تھا آج تو دیوان صاحب کی پھُرتی اور چُستی چالاکی قابل دید تھی ؛؛

دُوسرا:- ہم جوان ہیں مگر ہم میں بھی اتنا جوش نہ ہوگا۔ غضب کا آدمی ہے"

تیسرا:- آدمی؟ وہ انہیں آدمی کون کہتا ہے؟ کوئی رشی ہیں، گنہگار آدمیوں میں یہ طاقت کہاں۔ جوانی اور بڑھاپا سب اُن کے اختیار میں ہے، جب چاہیں بُڈھے بن جائیں، جب چاہیں جوان ہو جائیں"

چوتھا مسلمان تھا وہ سنجیدگی سے بولا۔ ضرور ضرور وہ ولی اللہ ہیں، آج بالکل نوعمر معلوم ہوتے تھے، وہ بڑھاپا کہیں نظر بھی نہ آتا تھا"

تیسرا:- اور جناب ہم تو دیکھ رہے تھے، دُشمن اُن کو دیکھتے ہی جوش باختہ ہو گئے جیسے کسی نے منتر پڑھ کر طاقت چھین لی ہو"

چوتھا:- آنکھوں سے آگ نکلتی تھی، خُدا رسیدہ بزرگوں کی یہی علامتیں ہیں، جس کی طرف دیکھ لیتے ہیں وہی بس میں ہو جاتا ہے۔ کچھ کرنا چاہے جب بھی نہیں کر سکتا"

دُوسرا:- اور اُن کا گھوڑا کیسا اُڑتا چلا جاتا تھا، یہ شاید آپ نے نہیں دیکھا"

تیسرا:- خُوب دیکھا۔ صرف دو گھنٹے کے عرصہ میں دشمن میدان چھوڑ بھاگا۔ بڑی تیاری کرکے آیا تھا"

چوتھا:- اب کبھی اِدھر کا رُخ بھی نہ کرے گا"

دُوسرا:- سمجھتا ہوگا بادشاہ عیاش ہے فتح کر لوں گا، مگر یہ معلوم نہ تھا

کہ دیوان صاحب کا سامنا ہے، کیسا بھاگا ؟"۔

تیسرا۔ اچھا سبق ملا ساری عمر یاد رکھے گا، مگر ایک بات اور سُننے میں آتی ہے ؛

چوتھا۔ کیا ؟

تیسرا۔ "بعض آدمی کہتے ہیں جب وہ دشمن سے لڑ رہے تھے اُس وقت ہم نے اُنہیں سمادھی میں بیٹھے دیکھا ہے "؛

چوتھا۔ "ہاں ہاں ! سُنا تو ہم نے بھی"؛

دوسرا۔ (حیرت سے) "ایک ہی وقت میں دو جگہ! یہاں بھی، وہاں بھی!! عجیب بات ہے"؛

چوتھا۔ "بھئی جس کی پیٹھ پر خدا کا ہاتھ ہوتا ہے اُس کے لئے کچھ بھی عجیب نہیں ہے۔ وہ جو چاہے کر دے، وہ چاہے تو تم ابھی ہوا میں اُڑنے لگو، ہم مُنہ دیکھتے ہی رہ جائیں۔ خدا کی دین ہے"؛

پہلا۔ "اور کیا، ورنہ ایسا کبھی ہو سکتا تھا"؛

دوسرا۔ "یہ دیوان نہیں شہر کا محافظ ہے"؛

یکایک ایک آدمی نے پیچھے مُڑ کر دیکھا اور دوسروں کو دکھایا، تو سب سناٹے میں آ گئے۔ "یہ کیا، دیوان صاحب چلے جا رہے تھے" ایک بولا، "تو یہ بھی دیکھ لو۔ شکل بدل کر ہم میں کھڑے تھے اب اپنی اصلی صورت میں

جا رہے ہیں، ہم نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ یہ مہاراج جو چاہیں کر سکتے ہیں۔ عجب نہیں جواب بھی کسی کی صورت میں کھڑے ہوں۔

دیوان صاحب سب کچھ سمجھ گئے، یہ کام ایکناتھ کے سوا کسی دُوسرے کا نہیں ہو سکتا۔ ضرور اُسی نے ہمارا لباس پہنا اور دُشمن کو بھگا کر لوٹ آیا۔ یہ لڑکا کتنا سمجھ دار ہے، کتنا بہادر۔ بادشاہ کا پروانہ آیا ہوگا ہم سمادھی میں تھے، ہمیں نہیں اُٹھایا خود لڑنے چلا گیا۔ کوئی بیوقوف بیوڑا شاگرد ہوتا تو کہتا، شہر تباہ ہوتا ہے تو ہُوا کرے ہمیں کیا، بیٹھے گورو کے حکم کی تعمیل کر رہے ہیں۔ پنڈت جی نے مندر میں پہنچتے ہی ایکناتھ کو گلے لگا لیا اور کہا، "تو نے میری لاج رکھ لی۔ ایکناتھ بار بار قدموں پر جھکتا تھا اور کہتا تھا، آپ مجھے شرمندہ کر رہے ہیں، میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔

پنڈت جی نے اُسے محبت کی نگاہوں سے دیکھا جیسے باپ بیٹے کو دیکھتا ہے اور کہا، "تمہاری بہادری کی لوگ بڑی تعریف کرتے ہیں۔ مجھے یہ معلوم ہی نہ تھا کہ تم تلوار کے بھی دھنی ہو۔"

ایکناتھ "یہ سب آپ کی دُعا ہے، ورنہ میرے بازوؤں میں ایسی طاقت کبھی نہ تھی۔"

پنڈت جی "لوگوں کو شبہ تک نہ ہُوا کہ تم ہو میں نہیں ہوں۔"

ایکناتھ "مہاراج! یہ سب آپ ہی کی بدولت ہے، ورنہ میں کس قابل

تھا۔ مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ میں نے آپ کا لباس پہنا اور گھوڑے پر سوار ہوا۔ اس کے بعد کیا ہوا مجھے خبر نہیں، مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی غیبی طاقت مجھے اُڑائے لئے جاتی ہے، جیسے میں اپنے آپ میں نہ تھا۔ یقیناً آپ کی طاقت میرے بدن میں آگئی تھی ورنہ یہ فتح کبھی حاصل نہ ہوتی۔ جسم میرا تھا طاقت آپ کی تھی"۔

پنڈت جی۔ "لوگ ابھی تک یہی سمجھتے ہیں کہ یہ میں ہی تھا"۔

ایکناتھ۔ خود میرا بھی یہی خیال ہے، کہ آپ نے مجھے اپنا ذریعہ بنایا۔

عقیدت مندی کا یہ انتہائی جذبہ دیکھ کر پنڈت جی آبدیدہ ہوگئے تھوڑی دیر بعد بولے "بیٹا! میں اب بڈھا ہوگیا، میرے لئے یہ ذمہ داری کا کام اب مشکل ہوتا جاتا ہے، میں چاہتا ہوں اب چار دن آرام کروں دیوان کا کام تم سنبھالو۔ مجھے چھٹی دو، آج کے واقعہ نے میری آنکھیں کھول دی ہیں، مجھے یقین ہوگیا ہے کہ تم اس عہدے کے پورے اہل ہو۔ بادشاہ سلامت کو اس میں ذرا بھی اعتراض نہ ہوگا۔ میرا جاکر دو لفظ کہہ دینا ہی کافی ہے وہ فوراً منظوری دیدیں گے۔ کہو جاکر کہہ دوں"؟

ایکناتھ کی آنکھوں میں آنسو آگئے، اُس نے دونوں ہاتھ باندھ لئے جیسے کوئی قصور ہوگیا ہو۔ وہ زمین پر گر پڑا اور نہایت انکساری سے بولا "مجھے کچھ نہیں چاہیئے، صرف آپ کے قدموں میں پڑا رہوں میرے

لئے یہی سب کچھ ہے ؂

پنڈت جی ایکناتھ کا مطلب سمجھ گئے، مگر خاموش رہے، ابھی ایک مرحلہ اور باقی تھا ؂

(۴)

صُبح کا وقت تھا، ایکناتھ پنڈت جی کے نہانے کے لئے پانی بھر رہا تھا، اتنے میں پنڈت جی کھڑاؤں پہنے ہوئے آئے اور مُسکرا کر بولے :-

بیٹا ایکناتھ! کل نئے سال کا پہلا دن ہے، اِس سال کا تمام حساب تیار کرلو، وقت تھوڑا ہے، صرف آج کا دن اور آج کی رات۔ مگر تمہارے جیسے قابل نوجوان کے لئے یہ کام چنداں مُشکل نہیں ؂

ایکناتھ نے پانی کا گھڑا ہاتھ سے رکھ دیا ؂

پنڈت جی "بادشاہ سلامت کل حساب دیکھیں گے، تیار ہو جائیگا یا نہیں اگر نہ ہو سکتا ہو تو مَیں بھی آ جاؤں؟"

ایکناتھ۔ (آہستہ سے) "مَیں کر لوں گا" ؂

پنڈت جی "تو جاؤ وقت ہے" ؂

ایکناتھ نے ہاتھ باندھ کر نمسکار کیا اور دفتر پہنچ کر حساب کتاب دیکھنے لگا، کام معمولی نہ تھا تمام سال کا حساب تھا اور وہ بھی کسی ساہوکار کا نہیں ایک ریاست کا۔ مگر ایکناتھ کے دل میں ذرا بھی گھبراہٹ نہ

تھی، نہ چہرے پر پریشانی تھی۔ اُس نے کتابوں کا ڈھیر سامنے رکھ لیا اور پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ سورج آسمان پر آہستہ آہستہ بلند ہوا اور پھر عین سر پر پہنچ گیا مگر ایکناتھ اُسی طرح بیٹھا حساب دیکھتا رہا۔ شام ہو گئی مگر ایکناتھ کو خبر نہ تھی، اُس کے سامنے صرف یہ سوال تھا کہ کام ختم کرنا ہے، نوکر آ کر دیا جلا گیا ایکناتھ کام کرتا رہا، اُسے کھانے پینے کی سُدھ نہ تھی، نہ سونے کا خیال تھا، خیال یہ تھا کہ کسی طرح کام ختم ہو جائے ورنہ بادشاہ کے سامنے گورو جی کا سر جھک جائے گا۔

آدھی رات گزر گئی ایکناتھ نے سارا حساب کتاب ختم کر لیا۔ سب کچھ ٹھیک تھا، صرف ایک پیسہ کا فرق تھا۔ ایکناتھ کے تیور بدل گئے سوچنے لگا کیا سب کئے کرائے پر پانی پھر جائے گا، بڑی بڑی رقوم کی از سر نو میزان کی، پھر بھی وہی فرق، پھر حساب کیا، مگر نتیجہ وہی ایک پیسے کا فرق جوں کا توں موجود تھا۔ ایکناتھ گھبرا گیا، آدھی رات سے زیادہ گزر چکی تھی چاروں طرف سناٹا تھا۔ لوگ اپنے اپنے گھروں میں چین کی نیند سو رہے تھے مگر ایکناتھ شمع دان کے سامنے بیٹھا حساب کتاب کر رہا تھا اور ایک پیسہ کی غلطی کہاں ہے یہ نہ سمجھ سکتا تھا۔

پچھلے پہر کے قریب پنڈت جناردن کی آنکھ کھلی، دریچہ سے دیکھا دفتر میں ابھی تک روشنی ہے، سمجھ گئے ایکناتھ جاگتا ہے، وہ آہستہ سے

اُٹھے اور مکان کا دروازہ کھول کر باہر آگئے، دفتر کے باہر چوکیدار سوگیا تھا ایکناتھ جاگتا تھا، پنڈت جی نے آہستہ سے کہا "ایکناتھ!"

لیکن ایکناتھ نے کوئی جواب نہ دیا، وہ اپنے حساب کتاب میں ہمہ تن محو تھا

پنڈت جی نے پھر پکار کر کہا "ایکناتھ!"

ایکناتھ نے کچھ نہیں سُنا ۔

پنڈت جی اور آگے بڑھے اور قدرے زور سے بولے "ایکناتھ!"

مگر جواب میں وہی خاموشی طاری تھی جیسے ایکناتھ اِس دُنیا ہی میں نہ تھا ۔ پنڈت جی کو تعجب ہُوا، وُہ اور آگے بڑھے اور شمع دان کے آگے اِس طرح کھڑے ہوگئے کہ اُن کے جسم کا سایہ ایکناتھ کی کتاب پر پڑا۔ مگر ایکناتھ کو اب بھی خبر نہیں ہوئی، اِس کے لئے کتاب کے حروف اسی طرح روشن تھے، اُس کی آنکھیں کتاب پر تھیں اور بائیں ہاتھ کا انگوٹھا ہاتھ کی دُوسری اُنگلیوں پر حرکت کر رہا تھا، اسی طرح آدھ گھنٹہ کے قریب گزر گیا ۔

یکایک ایکناتھ کو اپنی غلطی کا پتہ لگ گیا اور اُس نے مسرّت کا نعرہ مار کر آمدنی و خرچ برابر کر دیا۔ اُس کے بعد اُس نے کتاب بند کردی اور دونوں ہاتھ ملا کر اُوپر اُٹھالئے اور جمائی لینے لگا ناگاہ

اُس کی نظر پنڈت جی کی طرف اُٹھ گئی، وہ گھبرا کر آگے بڑھا اور پنڈت جی کے پاؤں پر جُھک گیا۔ پنڈت جی نے پُوچھا "حساب کتاب ہو گیا؟"

ایکناتھ "جی ہاں! آپ کب آئے؟"

پنڈت جی "ہم یہاں بڑی دیر سے کھڑے ہیں"

ایکناتھ چونک پڑا۔ پنڈت جی نے کہا "ہم نے تمہیں کئی آوازیں دیں، مگر تم نے ایک کا بھی جواب نہ دیا"

ایکناتھ نے سر جھکا کر کہا "میں نے ایک بھی آواز نہیں سُنی"

پنڈت جی "ہمارا سایہ کتاب پر پڑ رہا تھا، تمہیں یہ بھی معلوم ہُوا؟"

ایکناتھ۔ (ہاتھ باندھ کر) اب کیا عرض کروں مجھے شُبہ تک نہیں ہوا کہ کوئی یہاں کھڑا ہے"

پنڈت جی کھڑے تھے بیٹھ گئے اور ایکناتھ کے چہرے کی طرف دیکھ کر بولے "کل صُبح سے اِسی طرح بیٹھے تھے کیا؟"

ایکناتھ "جی ہاں اِسی طرح"

پنڈت جی "کچھ کھایا پیا بھی یا نہیں؟"

ایکناتھ "جی نہیں"

پنڈت جی "نیند بھی نہیں آئی"

ایکناتھ "ذرا بھی نہیں"

پنڈت جی :۔ "اس وقت کیا کر رہے تھے؟"
ایکناتھ :۔ "ایک پیسے کا فرق پڑتا تھا، اُسے نکال رہا تھا۔ بڑی مُشکل سے پتہ چلا"۔
پنڈت جی :۔ "ایک پیسہ کے لئے اتنی مغز پچی کیوں کی معمولی بات تھی؟"
ایکناتھ :۔ "مگر مہاراج غلطی آخر غلطی ہے۔ خواہ پیسہ کی ہو، خواہ لاکھ روپے کی"۔

پنڈت جی کا چہرہ مسرت کے نُور سے چمکنے لگا۔ نہایت سنجیدگی سے بولے "بیٹا! تُو نے مجھے خوش کر دیا۔ میرا امتحان بڑا سخت تھا۔ بڑے بڑے سادھو سنت بھی اس میں کامیاب نہ ہو سکتے۔ مگر تُو سب میں کامیاب ہُوا۔ تُو نے کالے کوسوں کا سفر پیدل طے کیا اور ثابت کر دیا کہ تیرا سینہ عقیدت کا لازوال خزانہ ہے، تُو نے دن رات میری خدمت کی اور ثابت کیا کہ تجھ میں سیوا بھاؤ ہے، تُو نے میدانِ جنگ میں فتح پائی جو دلیل اس امر کی ہے کہ تُو سرفروش اور جانباز بھی ہے، اور پھر دیوان کے عُہدے کو ٹھکرا دیا، کوئی بوالہوس اس عُہدے کے لئے اپنی زندگی بھر کی کمائی لُٹانے سے بھی دریغ نہ کرتا۔ یہ ترکِ دُنیا آسان نہیں لیکن میں نے تجھے اِس وقت بھی گورو منتر نہ دیا کیونکہ ابھی ایک امتحان باقی تھا آج وہ بھی ختم ہو گیا۔ میں نے دیکھنا چاہا

تھا کہ تجھ میں یکسوئی کی طاقت ہے یا نہیں، میں آیا میں نے آوازیں دیں، میں نے روشنی روک لی، لیکن تجھے خبر بھی نہ ہوئی۔ اب مجھے کوئی اعتراض نہیں، میں تجھے گورومنتر دینے کو تیار ہوں"۔

اس وقت ایکناتھ کے چہرے پر ایسی روشنی تھی جو اس فانی دنیا میں شاذ ہی نظر آتی ہے۔ آج وہ امتحان میں کامیاب ہُوا ہے، آج اُس کی برسوں کی محنت ٹھکانے لگی ہے۔

پنڈت جی نے سلسلۂ تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا:۔

"اور مجھے یہ بھی امید ہے کہ تو جس نے ایک پیسہ کی حقیر رقم کے لئے اپنا اتنا وقت قربان کیا ہے، ایشور بھگتی کے رستہ پر چلتے ہوئے اس اصول کو یاد رکھے گا اور رُوحانی دُنیا کی چھوٹی سے حقیر بُرائی کو بھی نظرانداز نہ کرے گا۔ جا اِس وقت آرام کر، کل میں تجھے روشنی اور پاکیزگی اور ابدی زندگی کی شاہراہ پر چلنے کی ہدایتیں دُونگا"۔

ایکناتھ کا چہرہ اور بھی چمکنے لگا۔

مصوّر کی زندگی

(۱)

"کھٹ کھٹ کھٹ!"

کسی نے دروازہ پر دستک دی، ٹھاکر سنگھ تصویر بنانے میں محو تھا۔ اُس نے آواز نہیں سُنی۔ گجری نے آہستہ سے کہا "کوئی آیا ہے"۔

ٹھاکر سنگھ نے تصویر پر برش پھیرتے پھیرتے مسکرا کر جواب دیا، "تو چلو! بھاگ کر اپنے گھونسلے میں چھپ جاؤ، نہیں کوئی دیکھ لیگا۔ تو کہے گا جس کی بیوی کے کپڑے بھی صاف نہیں وہ تصویر کیا خاک بنائے گا"۔

گجری نے رنگ کے پیالے میں اُنگلی ڈبو کر اپنے شوہر کی قمیص پر داغ لگا دیا، اور شوخی سے بولی "پہلے اپنے کپڑے تو دیکھ لو پھر مجھے بھی کچھ کہہ لینا"۔

ٹھاکر سنگھ چونک کر پرے سرک گیا، اور بولا "ارے! میری قمیص خراب کر دی۔ کیسی بیوقوف عورت ہے، باہر کوئی ملنے والا کھڑا ہے یہ اندر پھاگ کھیلتی ہے"۔

گجری نے رنگ سے بھری ہوئی اُنگلی ٹھاکر سنگھ کے مُنہ کے قریب لے جا کر کہا "خبردار! تم بولے اور میں نے تمہارا چہرہ رنگ دیا"۔

ٹھاکر سنگھ "بس میرا ہی چہرہ رنگنا جانتی ہو، یا کچھ اَور بھی سیکھا ہے اگر تصویر کا چہرہ رنگ سکو تو چار پیسے نہ کما لو"۔

گجری۔ (آگے بڑھ کر) "دیکھو جی! تم نے پھر زبان کھولی"۔

ٹھاکر سنگھ "بہت اچھا جمعدار صاحب! اب کے معاف کر دیں۔ کیا مجال جو اُف بھی کر جاؤں۔ واہ وا! بھئی بیوی تو ہمیں ملی ہے۔ بیوی بھی ہے جمعدار بھی ہے۔ مگر جمعدار صاحب! ...."

گجری۔ (مصنوعی غصہ سے) "تم پھیر بولنے مانگتا۔ چپ رہو۔ کوئی آتا ہے"۔

ٹھاکر سنگھ بیوی کی اس محبت آگیں ادا پر لوٹ گیا۔ وہ اُسے اُٹھا کر کلیجہ میں بٹھا لینا چاہتا تھا۔ جہاں اُسے دُنیا کی گرم ہوا تک نہ لگے۔

اتنے میں دروازہ پر پھر دستک کی آواز آئی۔

گجری نے دبے پاؤں جا کر دروازہ کی زنجیر کھول دی اور بھاگ کر

اپنے کمرے میں چلی گئی۔ ٹھاکر سنگھ نے بلند آواز سے کہا "چلے آئیے! دروازہ کھلا ہے"۔

نو وارد بیش قیمت لباس پہنے تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا کسی ریاست کا اہلکار ہے۔ شکل و صورت سے رعب برستا تھا۔ اُس نے ٹھاکر سنگھ کو سر سے پاؤں تک دیکھا اور کہا "میں سردار ٹھاکر سنگھ صاحب آرٹسٹ سے ملنا چاہتا ہوں"۔

ٹھاکر سنگھ کی آنکھیں جھک گئیں، خیال آیا، میرے کپڑے میلے ہیں۔ اُسے معلوم ہوا جیسے منہ پر میل لگ گیا ہو، جیسے کسی جلسہ میں بیٹھے ہوئے کپڑا پھٹ جائے۔ مگر کیا ہو سکتا تھا۔ آہستہ سے بولا "فرمائیے ٹھاکر سنگھ حاضر ہے"۔

یہ کہہ کر ٹھاکر سنگھ نے نو وارد کے سامنے کرسی رکھ دی۔

نو وارد نے کرسی پر بیٹھ کر کہا "خوب! میں سمجھتا تھا آپ بڈھے ہونگے، مگر میرا قیاس غلط نکلا۔ آپ تو ابھی بالکل نو عمر ہیں۔ میرا خیال ہے، آپ کی عمر پچیس چھبیس سال سے زیادہ نہ ہوگی"۔

ٹھاکر سنگھ۔ زمین کی طرف دیکھتے ہوئے آہستہ سے بولے "جی نہیں میری عمر تیس سال کے لگ بھگ ہے"۔

نو وارد۔ اس عمر میں ایسی تصویریں بنا لینا آپ ہی کا حصہ ہے۔

میں نے آپ کی چند ہی تصویریں دیکھی ہیں، دیکھ کر طبیعت شگفتہ ہو جاتی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ تصویریں نہیں ہیں۔ جاندار چیزیں ہیں، بعض وقت شبہ ہوتا ہے کہ ابھی مُنہ کھول کر بولنے لگیں گی۔ بہت مدّت سے خواہش تھی کہ چل کر درشن کروں آج اِس اشتیاق نے کھینچ لیا ؛

ٹھاکر سنگھ " یہ آپ کا حُسنِ ظن ہے، ورنہ میں تو مصوّر کہلانے کا بھی حقدار نہیں " ؛

نووارد (سُنا اَن سُنا کر کے) " آپ کی تصویریں خوب بکتی ہونگی ایسی عمدہ تصویریں نہ بکیں گی، تو کیا بکے گا۔ (پھر کمرہ کا جائزہ لے کر) لیکن آپ نے مکان اچھا نہیں لیا، یہ جگہ آپ کی شان کے شایان نہیں جو دیکھے گا یہی کہے گا کہ نام بڑا اور درشن چھوٹے " ؛

ٹھاکر سنگھ " دیکھئے! کوئی موزوں جگہ مل جائے تو اِسے چھوڑ دونگا" ؛

نووارد " مال روڈ پر چلیے۔ مال روڈ پر۔ وہاں آپ کا کاروبار اور بھی چمک اُٹھے گا۔ یہاں جو تصویر سَو پر اُٹھتی ہے وہاں اڑھائی سَو پر اُٹھے گی۔ مخمل کے ٹکڑے پر رکھ دینے سے اُسکی آب نہیں بڑھ جاتی مگر قیمت بڑھ جاتی ہے میرا تو خیال ہے وہاں چل کر آپ چند ماہ میں کہیں سے کہیں پہنچ جائیں گے " ؛

ٹھاکر سنگھ:۔ "آپ جیسے مہربانوں کی دُعا لگ جائے تو ایک سال میں سونے کے محل کھڑے کر لوں، لیکن یہ دُنیا اہلِ زر کی قدر کرتی ہے۔ اہلِ ہُنر کی نہیں۔ یہاں ہُنر قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتا ہے"۔

نو وارد نے نوجوان مصوّر کی طرف استعجاب کی نگاہوں سے دیکھا اور کہا:۔ "مگر اُسی وقت جب تک کہ کسی اہلِ دل کی نظر نہ چڑھ جائے"۔

ٹھاکر سنگھ نے بُرش ہاتھ میں لیا اور تصویر کی طرف دیکھ کر بولا "لیکن اہلِ دل اِس مکر و فریب کی دُنیا میں ہیں کہاں؟ عنقا کی طرح اس چیز کا نام سب نے سُنا ہے۔ مگر دیکھا بہت کم لوگوں نے ہے۔ شاید کسی نے بھی نہیں"۔

یہ لفظ نہیں تھے۔ مصوّر کے دل کے گھاؤ تھے، نو وارد کے سامنے سے پردہ ہٹ گیا۔ اُس پر صُورتِ حال روشن ہو گئی۔ یہ باکمال ضرور حادثاتِ زمانہ کا شکار ہے۔ یقیناً اس کا دل دُکھا ہُوا ہے، ورنہ اس کے مُنہ سے یہ شکوہ کبھی نہ نکلتا۔

نو وارد نے تھوڑی دیر بعد کہا "مَیں ریاست سکندھیر کا دیوان ہوں میرا نام دیوان ہرجس رائے ہے۔ مہاراجہ صاحب نہایت پاکیزہ مذاق کے آدمی ہیں، خصوصاً عمدہ تصویروں کے تو عاشقِ زار ہیں۔ اُن کو خوش کرنا ہو۔ تو کوئی بڑھیا سی تصویر نذر کر دو۔ پھر جو چاہو کرا لو۔ بلا عذر

کر دیں گے۔ ایک ماہ بعد اُن کی سالگرہ کا جشن ہے۔ میں اِس موقعہ پر اُنہیں کوئی عمدہ سی تصویر نذر کرنا چاہتا ہوں۔ روپے پیسے کا خیال نہیں میں مُنہ مانگا انعام دُونگا، لیکن تصویر ایسی ہو کہ ایک مرتبہ مہاراج دنگ رہ جائیں، خوش ہو جائیں، کہیں، یہ چیز تجھے کہاں سے مِل گئی۔ بس میں مہاراج کے اِن الفاظ کا بھُوکا ہوں۔

ٹھاکر سنگھ کے دِل میں اُمید کی نشاط انگیز گدگدی ہونے لگی دیوان صاحب کی طرف دیکھ کر بولا "اپنی عمر میں مجھے پہلی مرتبہ اُس شخص سے ملنے کا اتفاق ہُوا ہے جس کے پاس آرٹ دیکھنے والی آنکھ اور قدر کرنے والا دِل ہے"۔

دیوان صاحب "ایسی چیز بنائیے کہ مہاراج پھڑک اُٹھیں"۔

ٹھاکر سنگھ "دیوان صاحب! اپنے مُنہ سے اپنی تعریف کرنا مجھے زیب نہیں دیتا۔ لیکن میں آپ کو ایسی تصویر دُونگا کہ آپ خوش ہو جائیں"۔

دیوان صاحب "آپ کی جو تصویریں پہلے دیکھ چکا ہوں، اُن سے عمدہ ہوگی نا؟"

ٹھاکر سنگھ "آپ مطمئن رہئیے، راگی کو جب معلوم ہو جاتا ہے کہ اُس کے رو بر و راگ کو سمجھنے والا بیٹھا ہے، اُس وقت وہ اپنی بہترین چیز

گاتا ہے، معمولی چیز نہیں گاتا"۔
دیوان صاحب کھڑے ہو گئے اور بولے "تو آپ کب تک مجھے تصویر دیدیں گے"؟
ٹھاکر سنگھ بھی اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اُس نے اپنے دل میں اندازہ کر کے جواب دیا "ایک ماہ سے کم عرصہ میں تو کسی صورت تیار نہ ہو گی"۔
دیوار پر جلی حروف سے لکھا تھا "نصف دام پیشگی" دیوان صاحب نے یہ الفاظ آتے ہی دیکھ لئے تھے۔ ٹھاکر سنگھ دل میں سوچتا تھا، ابھی بٹوا کھولے گا، ابھی نوٹ گن کر دے گا۔ دیکھیں کیا دیتا ہے؟ امیر آدمی ہے اِسے روپے پیسے کی کیا پروا ہے؟ آرٹ کی باریکیوں کو خوب سمجھتا ہے۔ پانچ سات سَو سے کم کیا دے گا لیکن دیوان صاحب اُٹھے اور ہاتھ ملا کر رخصت ہو گئے۔ ٹھاکر سنگھ دیکھتا ہی رہ گیا۔ اُمید کے سُہانے بادل دیکھ کر غریب کسان کا دل نہال ہو گیا تھا، اُسے کیسی مسرت حاصل ہوئی تھی، کلیجہ بلیوں اُچھلتا تھا۔ لیکن ہوا کے ظالم جھونکوں نے بادل اُڑا دیئے، پانی کا ایک قطرہ بھی نہ برسا۔

(۲)

گجری دروازہ کی آڑ میں کھڑی سب کچھ سُن رہی تھی، دیوان صاحب کے چلے جانے پر اُس نے زینہ کا دروازہ بند کر لیا اور آ کر اپنے شوہر کا

ہاتھ تھام لیا۔ ٹھاکر سنگھ کی آنکھیں آب گوں تھیں، جیسے کسی کے ہاتھ آئی ہوئی دولت نکل گئی ہو۔ گجری نے ہمدردانہ انداز سے کہا "تم ناحق اپنا دِل چھوٹا کرتے ہو، اِس وقت روپیہ نہیں ملا، نہ سہی، رنجیدہ ہونے کی کیا بات ہے؟ بلکہ مَیں تو خوش ہو رہی ہوں۔ میرا دل کہتا ہے یہ شخص ہمارا سچّا خیر خواہ ہے۔ اِس کی ذات سے ہمیں بہت فیض پہنچیگا مگر اُسے کیا معلوم ہے کہ یہ بالکل ہی قلاش ہیں۔ یہ مکان، یہ پردے یہ فرنیچر یہ بجلی دیکھ کر کسی کو ایسا خیال بھی نہیں آسکتا"!

ٹھاکر سنگھ نے گجری کی طرف اس طرح دیکھا جس طرح مجرم عدالت کی طرف دیکھتا ہے اور کراہ کر جواب دیا "گجری! آج کرواچوتھ ہے اور ہمارے پاس ایک پیسہ بھی نہیں ہے، لوگ خوشیاں منا رہے ہیں ہم بیٹھے نصیبوں کو رو رہے ہیں"!

گجری "اب یہ اپنی اپنی قسمت ہے، جو قسمت میں لکھا ہے اُسے کون مٹا سکتا ہے؟ باقی رہی کرواچوتھ[1] کی بات، اس کا تم ذرا بھی فکر نہ کرو۔ کہیں سے آجائیگا کھالیں گے نہ آئیگا نہ کھائیں گے، بھوکے ہی سو رہیں گے۔ سری واہگورو پر بھروسہ رکھو، جس نے مُنہ چیرا

[1] یہ ہندوؤں کا بہت مشہور برت ہے۔ اس دن عورتیں سہاگ کا برت رکھتی ہیں اور چاند کو دیکھ کر اور اسے ارگھ دے کر کھانا کھاتی ہیں (مصنّف)

ہے کھانے کو بھی دے گا۔ مگر ہم بھی عجیب آدمی ہیں، جو مکان دیکھے، فرنیچر دیکھے وہ کبھی خیال بھی نہ کرے کہ ان کے پاس کچھ نہ ہوگا اور تو اور گھر میں نوکر بھی موجود ہے"۔

ٹھاکر سنگھ کو بیوی کی اِن باتوں سے گونہ تشفّی ہوئی، وہ سمجھتا تھا کہ دیوان صاحب کے جاتے ہی گجری اُنہیں گالیاں دینے لگے گی، قسمت کو بُرا بھلا کہے گی۔ لیکن شوہر کی رُوحانی اذیت کا خاتمہ کرنے کے وہ اُمید کی دیوی بن گئی، جو مایوس ہونا گناہ سمجھتی ہے۔ ٹھاکر سنگھ نے اُسے عقیدت بھری نگاہوں سے دیکھا، اور کہا "گجری تم سے کیا کہوں۔ جی چاہتا ہے تصویروں کو آگ لگا دوں اور کہیں نکل جاؤں۔ کام کرانے کو سبھی ہیں، پیسے دیتے وقت جان نکلتی ہے۔ کبھی کہتے ہیں کل آؤ۔ کبھی کہتے ہیں پرسوں آؤ"۔

گجری "یہی تو خرابی ہے، ورنہ ہمیں ذرا بھی تکلیف نہ ہوتی۔ خیر تیرتھ گیا ہے ابھی آجائیگا۔ دیکھیں کہیں سے کچھ لاتا ہے یا نہیں۔ یہ تصویر کس کی ہے؟"

ٹھاکر سنگھ "ایک رسالہ کے ایڈیٹر صاحب ہیں، اُن کی ہے"۔

گجری "کیسے آدمی ہیں؟"

ٹھاکر سنگھ "نہایت شریف"۔

گجری: "کچھ روپیہ پیسہ بھی ہے یا ہمارے ہی ایسے ہیں؟"
ٹھاکر سنگھ: "آدمی تو خاندانی معلوم ہوتے ہیں، آگے بھگوان جانے"۔
گجری: "تصویر بنا کرلے جاؤ تو فوراً پیسے دیدیں گے نا؟"
ٹھاکر سنگھ: "اب میں کسی کے دل کا حال کیا جانوں؟ مگر اُمید ہے انکار نہ کریں گے"۔
گجری: "تو اس تصویر کو پورا کیوں نہیں کرتے، کتنے روپے طے ہوئے ہیں"۔
ٹھاکر سنگھ: "میں نے تیس مانگے تھے، اُنہوں نے بیس سنائے، میرا خیال ہے پچیس پر فیصلہ ہو جائے گا"۔
گجری کے چہرے پر اُمید کی روشنی جھلکنے لگی، ہنس کر بولی "جالدی ختم کرو، ٹائم تھوڑا ہے، ورنہ جمعدار صاحب کھپا ہو جائے گا"۔
اب گجری پھر وہی ہنس مُکھ، بے فکر، بے پروا گجری تھی، جو بھوکی رہتی تھی، مگر غمگین نہ ہوتی تھی۔
ٹھاکر سنگھ نے بُرش اُٹھالیا اور تصویر بنانے لگا، کل شام سے کچھ کھایا نہ تھا، صبح کو بھوک معلوم ہوئی تھی مگر اس وقت پیاس بھی نہ تھی۔ جسم میں ایک نئی قسم کی چُستی کا احساس ہوتا تھا، کبھی ایک رنگ گھولتا کبھی دوسرا، اور تصویر بناتا جاتا تھا، آج اس کا ہاتھ کیسا تیز چلتا تھا، طبیعت ایسی جمی ہوئی تھی جیسے یار دوستوں میں بیٹھا شطرنج کھیل رہا ہو۔

اِس قدر یکسوئی اُس کی طبیعت میں کبھی نہ تھی، یہاں تک کہ شام کے پانچ بج گئے اور اُس نے سر نہ اُٹھایا، دفتر کے بابوؤں کو چھٹی ہوئی، پنچھی بھی بسیرا کرنے لگے گائیں اور بھینسیں بھی چراگاہوں سے واپس آگئیں مگر ٹھاکر سنگھ کو آرام کہاں؟ وہ ابھی تک اُسی جوش انہماک۔ اُسی سرگرمی سے تصویر مکمّل کرنے میں محو تھا۔ امید میں کتنی زندگی ہے، کتنی تحریک، کتنی بیداری، یُوں کہنے کو ایک کچّا تاگا ہے لیکن اسی کچّے تاگے میں وقت آنے پر کیسی طاقت آجاتی ہے؟

اتنے میں تیرتھ آگیا۔ خاوند بیوی دونوں کا کلیجہ دھڑکنے لگا، دیکھیں کچھ لایا ہے یا نہیں، ایک شیریں لفظ سُن کر دونوں کے دل کے کنول کھل جاتے اور اگر وہ خالی ہاتھ لوٹا ہو تو ــــــــ آدمی کس قدر حالات میں جکڑا ہوا، کس قدر مجبور، کس قدر بے دست وپا ہے۔ ٹھاکر سنگھ کو اُس سے پُوچھنے کی ہمّت نہ پڑی۔ لیکن عورت کمزور ہونے پر بھی حوصلہ نہیں ہارتی اُس نے تیرتھ سے پُوچھا "تو سارا دِن کہاں رہا؟ بول کچھ لایا بھی یا نہیں؟"

تیرتھ نے آہستہ سے جواب دیا "کسی نے بھی نہیں دیا"۔

ٹھاکر سنگھ کے دل میں کسی نے چھرا بھونک دیا۔ اُس نے تلملا کر پُوچھا "امرت فیکٹری والوں نے کیا کہا؟"

تیرتھ: "کہا کہ سرکار صاحب کہیں باہر گئے ہیں، آئیں گے تو بھجوا دیں گے"۔
ٹھاکر سنگھ: "اور بیسٹ واچ کمپنی والے نے؟"
تیرتھ: بولے۔ "آج تو پیسے کی بھی بکری نہیں ہوئی، کل آنا"۔
ٹھاکر سنگھ: "اور رائے صاحب ہوتو رام؟"
تیرتھ: "وہ ابھی کراچی سے نہیں لوٹے"۔
ٹھاکر سنگھ: "اور تو اس وقت تک کہاں مر گیا تھا۔ روپے نہ ملے تھے تو تو گھر آجاتا۔ کہیں اور بھیج دیتا۔ اب اس وقت کیا کروں؟"

تیرتھ نے سہم کر جواب دیا "میاں یعقوب کی طرف چلا گیا تھا، انہوں نے ٹھہرا لیا، کہ ابھی منی آرڈر آتے ہیں لے کر جانا، وہیں بیٹھا رہا آخر اٹھ آیا۔ وہ تو اب بھی نہ آنے دیتے تھے، کہتے تھے ذرا اور ٹھہر جاؤ شاید کوئی دینے والا ہی آجائے، تہوار کا دن ہے، خالی ہاتھ جاؤ گے تو سرکار صاحب خفا ہوں گے"۔

ٹھاکر سنگھ بڑبڑاتا ہوا اٹھا اور تصویر لے کر باہر چلا گیا۔ گجری ہونے لگی شام ہو گئی تھی۔ بیاہی ہوئی عورتیں اپنے اپنے تھال میں مٹھائی بادام اور گھی کے چراغ رکھ کر سہاگن لڑکی کی کتھا سننے جا رہی تھیں۔ اس وقت ان کے چہرے کیسے خوش تھے، آنکھیں کیسی منور جیسے کنول کے پھول میں دیا جل رہا ہو۔ آج انہوں نے خاوند کی سلامتی کا برت

رکھا تھا آج وہ اپنے سہاگ کے لئے دُعا کرنے جا رہی تھیں۔ مگر گجری کیا کرے؟ اُس کی رُوح اسیرِ قفس پرندے کی طرح بیتاب تھی، جو اُڑنا چاہتا ہے مگر اُڑ نہیں سکتا، اُس نے آہ سرد بھری اور آسمان کی طرف دیکھنے لگی۔

معاً اُس کی پڑوسن نے ساتھ کے برانڈے سے پُکار کر کہا "بہن گجری چل کتھا سُن آئیں"۔

گجری سِسک سِسک کر رونے لگی، جیسے کسی نے پکا ہُوا پھوڑا چھیڑ دیا ہو، سوچتی تھی میں کیسی بدقسمت ہوں، جو سہاگ کے برت کے دن سہاگ کی کتھا سُننے بھی نہیں جا سکتی۔ مگر پھر خیال آیا، پڑوسن کیا کہے گی، اُس نے بہتے ہوئے آنسوؤں کا سیلاب روک لیا، اور اپنی آواز بدل کر جواب دیا "بہن میں تو سُن بھی آئی ہوں"۔

پڑوسن چلی گئی گجری پھر اُداس ہو گئی، اُسے سنگ دل امیروں پر رہ رہ کر غصّہ آ رہا تھا جو غریب آدمیوں سے کام کرا لیتے ہیں، پیسے وقت پر نہیں دیتے۔ اِس وقت وہ ایسی خونخوار ہو رہی تھی، کہ اگر کوئی امیر آدمی اُس کے سامنے آ جاتا تو اُس کا مُنہ نوچ لیتی سوچتی تھی سب نے انکار کر دیا، کسی نے اتنا بھی نہ سوچا کہ چلو دے دو، تہوار کا دن ہے اُسے بھی ضرورت ہو گی۔ ایسے ہی پاپوں کی بدولت تو بارش

نہیں ہوتی، اِسی لئے نِت نئے قحط پڑتے رہتے ہیں۔

آدھ گھنٹہ گزر گیا۔ گجری اُسی طرح بیٹھی رہی، اُس کے چاروں طرف اندھیرا تھا، مگر اُسے اِس کی ذرا بھی پروا نہ تھی۔ یہ باہر کی تاریکی اُس کے دل کی تاریکی کے مقابلہ میں کیا حقیقت رکھتی تھی؟ کچھ بھی نہیں۔

اتنے میں تیرتھ نے آکر کہا "بی بی جی! کچھ کھانے کو ہے یا نہیں بہت بھوک لگی ہے"۔

لفظ معمولی تھے لیکن گجری کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ جیسے خشک بارود بعض وقت رگڑ سے بھی جل اُٹھتی ہے۔ گرج کر بولی "تو آدمی ہے یا اُلّو؟ دیکھتا نہیں ہے کہیں سے بھی پیسے نہیں ملے مروّت تو ان لوگوں کو چھو بھی نہیں گئی، مالک مرے یا جئے۔ اِن کی بلا سے۔ ان کو اپنے کام سے کام ہے"۔

تیرتھ کھانے کے عوض گالیاں پاکر چپ چاپ اُدھر چلا گیا اور اپنی حماقت پر پچھتانے لگا۔ اِدھر تھوڑی دیر بعد گجری ہمّت کر کے اُٹھی اور چھجّے پر سے پڑوسن کو بُلا کر بولی "بہن! ذرا ایک چونّی دینا، وہ باہر گئے ہیں۔ میرے پاس دس روپے کا نوٹ ہے، ابھی آتے ہیں تو لوٹا دیتی ہوں"۔

اِس وقت اُس کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ سوچتی تھی اگر اُس نے اِنکار کر دیا تو کیا ہو گا؟ عزّت خاک میں مل جائے گی۔ مگر اُس کے اندیشے باطل ثابت ہوئے، پڑوسن نے چونی دیدی، اب گُجری کے چہرے پر رونق آگئی۔ اُسے ایسا معلوم ہُوا جیسے یہ چونی نہیں چار سَو روپیہ ہے۔ جیسے وہ دریا کے دھارے میں ڈوبتے ڈُوبتے بچ گئی ہے۔ وہ تیرتھ کو بُلا کر بولی، "جا جا کر دو آنے کے چاول لے آ ایک آنے کی چینی، ایک آنے کا دُودھ۔ مگر ذرا جلدی آنا، تیری عادت ہے جہاں چار آدمی دیکھے، کھڑا ہو گیا"۔

تیرتھ بازار گیا، گُجری نے جلدی سے آگ جلائی، اور تیرتھ کا انتظار کرنے لگی۔ مگر آدھ گھنٹہ گزر گیا۔ اور تیرتھ نہ آیا، آخر کدھر چلا گیا، اتنی دیر کہاں لگ گئی؟ پاس ہی تو دُکان ہے۔ دو منٹ کا رستہ ہے، ضرور کہیں کھڑا ہو گیا ہو گا، کمبخت کو اتنا بھی خیال نہیں، کہ آج تہوار کا دن ہے، سردار صاحب آتے ہیں، تو کہتی ہوں، اِس لونڈے کو جواب دو، مَیں باز آئی ایسے نوکر سے۔ وقت بے وقت بھی نہیں دیکھتا یہاں آگ جل رہی ہے۔ وہ کہیں وہاں کھڑا وقت ضائع کر رہا ہو گا۔

مگر آدھ گھنٹہ اور گزر گیا۔ اور تیرتھ پھر بھی نہ آیا۔ اب گجری کے غُصہ نے فکر و تشویش کی صُورت اختیار کر لی۔ سوچنے لگی کہیں کسی

گاڑی تلے نہ آگیا ہو، آنکھیں بند کر کے چلتا ہے، سامنے تو دیکھتا ہی نہیں۔ گجری کا دل دہل گیا گویا تیرتھ درحقیقت گاڑی تلے کچلا گیا ہے۔ اتنے میں وہ آکر سامنے کھڑا ہو گیا، اور سسک سسک کر رونے لگا، گجری نے گھبرا کر پوچھا "کیوں کیا ہوا ہے؟"

تیرتھ نے ہاتھ باندھ کر جواب دیا "چونی کہیں گر گئی ہے"۔

گجری نے ٹھنڈی آہ کھینچی اور انتہائے یاس سے وہیں بیٹھ گئی۔ اُس کے مُنہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ اندھیری رات میں بھولے ہوئے مُسافر کو ایک چھوٹی سی پگڈنڈی ملی تھی۔ کتنی محنت، کس قدر عرقریزی کے بعد لیکن دیکھتے دیکھتے وہ بھی جھاڑیوں میں گم ہو گئی۔ اب مُسافر کے چاروں طرف تاریکی تھی، روشنی کہیں بھی نہ تھی۔

(۳)

اُدھر ٹھاکر سنگھ تصویر لے کر اخبار شوکت ہند کے دفتر میں پہنچا اور ایڈیٹر سے بولا "لیجئے بندہ پرور! تصویر تیار ہو گئی"۔

ایڈیٹر صاحب نے تصویر کو ایک اُچٹتی ہوئی نگاہ سے دیکھا اور بے پروائی سے میز کے ایک کونے کی طرف اشارہ کر کے کہا "رکھ دیجئے"، اور یہ قدر تھی اُس چیز کی، جسے مصوّر نے بھوکا رہ کر تیار کیا تھا، جس پر اُس نے اپنی بہترین قابلیتیں صرف کی تھیں۔ کیا اُس کے

لئے اس سنگ دل اندھے کے پاس تعریف و ثنا کے دو میٹھے لفظ بھی نہ تھے؛ صرف دو لفظوں سے اُس کی تسکین ہو جاتی، وہ اپنی محنت بھول جاتا۔ سمجھتا دُنیا ابھی قدر دانوں سے خالی نہیں ہو گئی، اہلِ زر نہیں، اہلِ نظر تو ہیں۔ صاحبِ کمال کے لئے یہی بہت کچھ ہے، مگر یہاں وہ بھی نہ تھا۔ ٹھاکر سنگھ کے دل میں خیال آیا کہ تصویر اُٹھا لوں، اور کہوں۔ جناب! میں آپ کے ہاتھ تصویر نہ بیچوں گا۔ اگر آپ کو میرے آرٹ کی پروا نہیں، تو مجھے بھی آپ کے روپوں کی پروا نہیں۔ مگر پھر گھر کا اور گھر کی افسوسناک حالت کا منظر آنکھوں تلے پھر گیا۔ ضرورت نے غیرت کا گلا گھونٹ دیا۔ تصویر کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "آپ ذرا دیکھ تو لیتے"۔

اَیڈیٹر "صبح دیکھوں گا۔ اِس وقت رہنے دیجئے"۔

ٹھاکر سنگھ "نہایت عمدہ بنی ہے، آپ بے حد پسند کریں گے"۔

اَیڈیٹر "یہ کہنے کی ضرورت ہی نہیں ہے، آپ جس چیز کو ہاتھ لگائیں گے وہی خوبصورت بن جائے گی۔ خوبصورتی تو آپ کے ہاتھ کا میل ہے"۔

ٹھاکر سنگھ۔ (شرما کر) "آپ تو مجھے بنانے لگے"۔

اَیڈیٹر "جی نہیں، میرا حقیقت میں یہی خیال ہے"۔

ٹھاکر سنگھ:۔ پورے تین دن میں تیار ہوئی ہے۔

ایڈیٹر:۔ آپ چاہتے تو ایک دن میں بنا لیتے، بلکہ میرا تو خیال ہے آپ جم کر بیٹھ جاتے تو تین چار گھنٹوں سے زیادہ کا کام نہ تھا"۔

ٹھاکر سنگھ:۔ یہ آپ کا حُسنِ ظن ہے، ورنہ اچھی چیز اچھا وقت کھائے بغیر جوان نہیں ہوتی"۔

ایڈیٹر:۔ ارے! آپ تو شعر بھی کہنے لگے"۔

ٹھاکر سنگھ۔ (مسکرا کر) "آپ کی نگاہِ کرم ہو گی تو شعر بھی کہنے لگوں گا۔ (ذرا دیر چُپ رہنے کے بعد) تو اب اجازت دیجئے"۔

ایڈیٹر:۔ بہت اچھا۔ پھر کسی دن تشریف لائیے گا، ایک اور تصویر تیار کرانے کا خیال ہے"۔

ٹھاکر سنگھ:۔ کہئے کل ہی چلا آؤں (ہچکچا کر) اور اس تصویر کے روپے؟

ایڈیٹر۔ (ہنس کر) "اتنی جلدی"۔

ٹھاکر سنگھ:۔ صاحب! کیا عرض کروں، ہاتھ بہت تنگ ہے"۔

ایڈیٹر:۔ تو دو چار دن میں منگوا لیجئے گا"۔

ٹھاکر سنگھ:۔ اجی صاحب! اس قدر بھی ظلم نہ کیجئے گا۔ بڑی آس لے کر آیا ہوں، اسی وقت دلوا دیجئے"۔

ایڈیٹر۔ (کرسی سے اُٹھ کر) "دو چار دن سے پیشتر تو کسی صورت نہ

دے سکوں گا"۔

ٹھاکر سنگھ "تو اِس وقت پانچ ہی روپے دِلوا دیجئے"۔

ایڈیٹر۔ (سر ہلا کر) "اِس وقت پانچ پیسے بھی نہ مِل سکیں گے"۔

ٹھاکر سنگھ "لیکن آپ نے تو کہا تھا، تصویر بنا کر لاؤ، روپے فوراً مِل جائیں گے"۔

ایڈیٹر "معلوم ہوتا ہے، آپ ہمیں چور سمجھ رہے ہیں، جو آپ کی تصویر لے کر روپوش ہو جائیں گے۔ یہاں چھ چھ مہینے تک بِل پڑے رہتے ہیں، کوئی ایک مرتبہ بھی تقاضا نہیں کرتا، آپ آتے ہی سر ہو گئے"۔

ٹھاکر سنگھ "اُن کے پاس کھانے کو ہوگا، نہ مانگتے ہونگے، یہاں مزدوری کرتے ہیں، جو مِلتا ہے کھا لیتے ہیں"۔

ایڈیٹر "آپ تو نیچے جھاڑ کر پیچھے پڑ گئے، ایک مرتبہ کہہ دیا، اسوقت روپے نہیں ہیں، معاف کرو، مگر جناب اپنی ہی کہے جاتے ہیں"۔

اب ٹھاکر سنگھ بھی تیز ہو گیا، بولا "اگر آپ کے پاس روپے نہ تھے تو آپ نے کام کیوں کرایا، مَیں کوئی دُوسرا کام کر لیتا"۔

ایڈیٹر صاحب سنّاٹے میں آ گئے۔ سوچنے لگے یہ شخص کتنا اوچھا ہے کس قدر ذلیل ہے، اِسے میری عزّت کا ذرا بھی خیال نہیں، تھوڑی دیر بعد بولے "آپ اپنی تصویر لے جائیں، مجھے اِس کی ضرورت نہیں"۔

ٹھاکر سنگھ نے حیران ہو کر کہا "آپ نے تو خود کہہ کر بنوائی ہے"۔

ایڈیٹر "مگر جناب مجھے کیا معلوم تھا کہ آپ ایسی بے معنی اور لغو تصویر بنا لائیں گے، اس سے عمدہ تصویر تو سکول کے طالب علم بنا سکتے ہیں۔ اور مجھے تو شبہ ہے کہ یہ بھی آپ کے کسی شاگرد کی بنائی ہوئی ہے، آپ کی نہیں، چلے ہیں ہمیں چکمہ دینے، لیکن جناب ہم بھی ہاتھ پہچانتے ہیں، ہاتھ!"

ٹھاکر سنگھ نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا "لیکن تصویر تو آپ نے ابھی تک دیکھی ہی نہیں"۔

ایڈیٹر "آتے ہی دیکھ لی، مجھے ذرا بھی پسند نہیں، رسالہ میں چھاپ دوں تو لوگ کہیں گے ایڈیٹر پاگل ہو گیا ہے"۔

ٹھاکر سنگھ کا سر چکرانے لگا آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ تصویر لے کر چُپ چاپ باہر چلا آیا دل میں پچھتاتا تھا کہ ناحق بات بڑھائی آج روپے نہ ملتے کل پرسوں مل جاتے۔ اب وہ بھی گئے، تصویر ان کی ہے، دُوسرا کوئی شخص اس کے لئے پیسہ بھی نہ دیگا۔ ٹھاکر سنگھ چاہتا تھا ایڈیٹر واپس بُلا کر تصویر مانگ لے تو چُپ چاپ دیدوں، ذرا بھی عذر نہ کروں، مگر وہ دُور نکل آیا اور اُسے کسی نے بھی نہ بُلایا۔

اب چاروں طرف نا اُمیدی تھی، کیا کرے کیا نہ کرے، بہت سوچتا تھا مگر کوئی آدمی ایسا دکھائی نہ دیتا تھا جو اِس وقت امداد دے۔ گھر جاتے ہوئے بھی ڈر لگتا تھا، گُجری کیا کہے گی؟ آج کروا چوتھ کا برت ہے ہندو عورتیں چاند کو ارگھ دے کر مٹھائی اور پھل کھائیں گی ہمارے گھر میں آٹا بھی نہیں ہے، بدقسمتی تو دیکھو لکڑیوں کے سوا سب کچھ ختم ہو گیا۔ ٹھاکر سنگھ شہر سے باہر جا کر ایک کھُلے میدان میں بیٹھ گیا اور اپنی کم نصیبی پر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ کبھی سوچتا تھا، دریا میں مروں، اِس زندگی سے موت ہی بھلی۔ کبھی خیال آتا سادھو ہو جاؤں گُجری باپ کے پاس چلی جائے گی چار دن یاد کر کر کے روئے گی پھر ہمیشہ کے لئے بھول جائے گی۔ مگر اس میں اِس کے لئے بھی ہمت نہ تھی۔

آخر وہ اُٹھا اور شہر کی طرف روانہ ہُوا جیسے کوئی شخص بھیک مانگنے جا رہا ہو پہلے دھیرے دھیرے چلا پھر تیز تیز قدم اُٹھانے لگا اُمید کے قریب پہنچ کر ہم بیتاب ہو جاتے ہیں، ہم میں انتظار کا صبر نہیں رہتا۔ اب ٹھاکر سنگھ کو ایک دوست کا خیال آ گیا تھا۔ شاید اِس نا امیدی کے وقت میں وہی کام آ جائے۔

(۴۴)

رات کے ساڑھے آٹھ بجے کا وقت تھا، کروا چوتھ کا چاند نکلنے میں تھوڑی دیر باقی تھی۔ ہر مکان پر عورتیں کھڑی تھیں اور بے چین و مضطرب نگاہوں سے آسمان کی طرف دیکھ رہی تھیں، کہ چاند نکلا ہے یا نہیں، جو کمسن تھیں وہ کہتی تھیں چاند کو آج ہی بیر لینا تھا پہلے تو اتنی دیر کبھی نہ ہوتی تھی، جو بڑی بوڑھی تھیں وہ انہیں تسلّی دیتی تھیں، کہتی تھیں ذرا صبر کرو۔

لیکن گجری اپنے تاریک کمرے میں اوندھے مُنہ لیٹی تھی، وہ چاند کا کیا انتظار کرتی۔ اُس کے پاس ارگھ دینے کو کچّی لسّی بھی نہ تھی، نہ برت کھولنے کو روٹی کا ٹکڑا تھا۔ مایوس ہو کر لیٹی تھی، اور قسمت کو گالیاں دیتی تھی۔ اتنے میں ٹھاکر سنگھ نے آکر اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا، اور پیار سے کہا "لو اُٹھو! چاند نکل آیا، چل کر ارگھ دے لو، لسّی اور گنڈیریاں نہ سہی، ٹھنڈا پانی تو ہے، چاند دیوتا کچھ کھاتا پیتا تھوڑی ہے دل کی عقیدت دیکھتا ہے، اور اُس کی تمہارے پاس کمی نہیں"۔

گجری چُپ چاپ اُٹھ کر کھڑی ہو گئی، اُس نے اتنا بھی نہ پوچھا کہ تصویر کے دام ملے یا نہیں۔ سمجھ گئی، نہ ملے ہونگے۔ مل جاتے تو ناچتے ہوئے آتے۔ بیدلی سے خاوند کے ساتھ اُوپر چلی گئی۔ اور مُنہ ہاتھ دھو کر

بولی "شدھ جل کا لوٹا منگوا دو تو ارگھ دے لوں"۔
ٹھاکر سنگھ:۔ "وہ دیکھو! پانی کا لوٹا چوکی پر دھرا ہے جا کر اُٹھا لو"۔
گجری نے چوکی کے پاس جا کر لوٹے میں پانی کے بجائے دُودھ کی کچّی لسّی دیکھی، تو چونک پڑی۔ جیسے چلتے ہوئے صحرا میں کسی نیم جاں مُسافر کو برگد کا سرد اور سرور بخش سایہ مل جائے۔ تنک کر بولی "تُم نے مجھے سخت دھوکا دیا۔ پہلے کیوں نہ کہہ دیا (اور چیزیں دیکھ کر) ارے یہ تو بہت کچھ ہے، کیا کیا لے آئے؟"
ٹھاکر سنگھ:۔ "پہلے ارگھ دے لو، بعد میں باتیں کریں گے"۔
گجری:۔ "کیسے جھوٹے آدمی ہیں، کہتے تھے پانی ہی سے ارگھ دے لو"۔
ٹھاکر سنگھ۔ (مسکرا کر) "مگر اب تو چاول اور گنڈیریاں بھی ہیں"۔
گجری نے لسّی، چاول اور گنڈیریوں سے چاند کو ارگھ دیا، اور دونوں ہاتھ باندھ کر صدقِ دل سے شوہر کی سلامتی کے لئے پرارتھنا کی۔ اس وقت اُسے چاند مسکراتا ہُوا دکھائی دیا، جیسے اُسے آشیرباد دے رہا ہے، جیسے اُس سے کہہ رہا ہے۔ تُم تو ناحق گھبرا رہی تھیں۔ اب گجری کو ایسا معلوم ہوتا تھا گویا ہوا میں تیر رہی ہے، اُس کے مُنہ سے ہنسی پھُوٹ پھُوٹ کر نکلتی تھی۔ گجری روکتی تھی مگر نہ رُکتی تھی۔ ارگھ دینے کے بعد وہ اٹھلاتی ہوئی اپنے مصوّر شوہر کے پاس آ کر بیٹھ گئی! اور بولی۔

"کہو کیا کیا چیزیں لائے اور یہ روپے کہاں سے ملے؟"

ٹھاکر سنگھ نے مٹھائی کی ٹوکری گجری کے سامنے رکھ دی اور کہا "یہ پھر بتاؤں گا، لو نمبر ایک"۔

گجری نے مٹھائی دیکھی تو اُس کے منہ میں پانی بھر آیا، تاہم تحمّل سے بولی "اِتنی کیوں لے آئے؟ دو روپے سے کم کی نہ ہوگی"۔

ٹھاکر سنگھ "ایک روپے کی تو تنہا میں ہی کھا جاتا اور عجب نہیں اس سے بھی زیادہ کھا جاؤں، کل سے بھُوکا ہوں، اور کیا۔ دیکھنا کیسے بڑھ بڑھ کے ہاتھ مارتا ہوں، صرف اجازت کی دیر ہے"۔

گجری (مُسکرا کر) "اچھا اور کیا لائے؟"

ٹھاکر سنگھ نے پھلوں کی ٹوکری آگے بڑھا کر جواب دیا "نمبر دو"۔

گجری نے دیکھا کچھ سیب تھے، کچھ انار۔ آدھ سیر کے قریب انگور، ایک سردا۔ گجری کی طبیعت ہری ہوگئی۔ ادائے بیخودی سے جھُومتی ہوئی بولی ۔

"اب معلوم ہوا، آج کرواچوتھ کا دن ہے"۔

ٹھاکر سنگھ نے جیب سے ایک بنڈل نکال کر کھولا، اس میں ایک ریشمی ساڑھی تھی، گجری کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ ٹھاکر سنگھ نے کسی

مداری کے مانند کہا "نمبر تین"۔

گجری نے اپنا نازنین سر ٹھاکر سنگھ کے کندھے پر رکھ دیا اور آنکھیں موند لیں، خوشی کا یہ عالم تھا، کہ منہ سے بات بھی نہ نکلتی تھی، تمام دن کی پریشانی آنِ واحد میں رفع ہوگئی۔ ٹھاکر سنگھ نے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا "اب بھی خوش ہوئی یا نہیں"۔

گجری "زبان سے کیا کہوں، میرا چہرہ دیکھ لو" یہ کہہ کر اُس نے شوہر کی طرف دیکھا، اور مسکرانے لگی۔

ٹھاکر سنگھ نے گجری کا منہ دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا اور کہا "لو اب ہمارا بھی چاند نکل آیا، مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہ مجھ سے باتیں کر رہا ہے، جانتی ہو کیا کہتا ہے؟"

گجری (شرارت سے)

ٹھاکر سنگھ "نہیں نہیں، کہتا ہے، مجھے ارگھ دے لو"۔

یہ کہتے کہتے ٹھاکر سنگھ نے ایک پیڑا اُٹھایا اور گجری کے منہ میں دیدیا، گجری انکار کرتی ہی رہ گئی، لیکن ٹھاکر سنگھ نے ایک نہ سُنی۔ اُس نے کہا "تم نے اپنے چاند کو ارگھ دیا یا نہیں، ہم اپنے چاند کو ارگھ دیئے بغیر منہ جھوٹا کیسے کرلیں؟"

گجری نے بھی ایک پیڑا خاوند کے منہ میں دیدیا، دونوں خاوند بیوی

کھانے لگے۔

اتنے میں تیرتھ نے اوپر آ کر کہا "میاں یعقوب کا آدمی بیس روپے دے گیا ہے"۔

ٹھاکر سنگھ کا چہرہ اور بھی چمکنے لگا، گجری نے تیرتھ کے ہاتھ سے روپے لے کر کہا "پہلے مل جاتے تو ذرا بھی تکلیف نہ ہوتی"۔

ٹھاکر سنگھ:- "اس حالت میں یہ چیزیں اتنی میٹھی کبھی نہ لگتیں"۔

گجری (سنجیدگی سے) "یہ تو آپ نے بجا کہا، اس وقت ان کا ذائقہ ہی اور ہے"۔

معاً کسی نے نیچے سے آواز دی، تیرتھ نے پوچھا "کون ہے؟"

"ذرا سردار صاحب کو بھیج دیجئے"۔

گجری نے منہ بنا کر کہا "یہ اس وقت کون آ گیا۔ بیٹھے رہئے، لوگ ذرا بیٹھنے بھی تو نہیں دیتے"۔

ٹھاکر سنگھ (ہنس کر) "گھبراتی کیوں ہو، میں نیچے جا رہا ہوں، دلّی تو نہیں جا رہا۔ ابھی ایک منٹ میں آیا"۔

گجری:- "اس وقت ایک منٹ بھی ایک گھنٹے سے کم نہیں"۔

ٹھاکر سنگھ نیچے چلا گیا، لوٹا۔ تو چہرہ مسرت کے نور سے درخشاں تھا گجری نے پوچھا "کون تھا؟"

ٹھاکر سنگھ:- "دیوان ہرجس رائے کا آدمی تھا"۔

گجری:۔ "کون ہرجس رائے؟ وہی تو نہیں جو آج دوپہر کو آیا تھا؟"
ٹھاکر سنگھ:۔ "بس۔ بس وہی۔ اُسی نے تصویر کے لئے پیشگی روپیہ بھیجا ہے"۔
گجری کے دل میں گدگدی ہونے لگی۔ جلدی سے ٹھاکر سنگھ کے پاس آکر بولی "کتنا روپیہ بھیجا"؟
ٹھاکر سنگھ نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر جواب دیا۔
"صرف اڑھائی سو روپیہ"۔
گجری کا دل خوشی سے دھڑکنے لگا۔ بولی "جھوٹ تو نہیں بول رہے آپ"؟
ٹھاکر سنگھ:۔ "جھوٹ بولوں گا تو میرا یہ جمعدار مجھ سے ناراض نہ ہو جائیگا یہ لو ڈھائی سو کا چک رہا"۔
گجری چک اور ریشمی ساڑھی لے کر جلدی جلدی نیچے اُتر گئی، ٹھاکر سنگھ بھی مُسکراتا ہُوا اس کے پیچھے پیچھے چلا گیا۔

سَدا سُکھ

(۱)

کانگڑہ کی پُر فضا اور سرسبز و شاداب گھاٹیوں میں بیج ناتھ ایک چھوٹی سی بستی ہے۔ جہاں ہندوؤں کا ایک مشہور مندر ہے، یہاں ایک دن صبح کے وقت لوگوں نے دیکھا کہ بازار میں ایک سفید ریش پردیسی کھڑا ہے یہی سَدا سُکھ تھا +

سَدا سُکھ کون تھا، یہ کوئی بھی نہ جانتا تھا، لیکن وہ کیسا تھا، یہ سب کو پہلے ہی دن معلوم ہو گیا۔ اُس کی شکل و صورت خوفناک تھی۔ دیکھ کر دل دہل جاتا تھا۔ لیکن آواز ایسی دلکش اور شیریں تھی، کہ جی چاہتا گھنٹوں بیٹھ کر سُنتے رہیں۔ ناریل اُوپر سے سخت اور کھُردرا ہوتا ہے۔ لیکن اس کے اندر کا پانی کس قدر میٹھا ہوتا ہے، کتنا صحت بخش، یُوں دیکھنے کو اس کا رنگ کچھ اتنا صاف نہیں ہوتا لیکن اس میں جو حلاوت

ہے۔ وہ چشمہ کے پانی میں بھی نہیں پائی جاتی۔ اُس دن کے بعد بیج ناتھ میں ایک نئے دَور کا آغاز ہو گیا سَدا سُکھ یتیموں کا باپ تھا، نا اُمیدوں کا سہارا، بیماروں کا خدمت گذار، چائے کے باغیچوں میں کام کرنے والی غریب عورتوں کو اپنا ہمدرد مل گیا اب اُن کی طرف نگاہِ بد سے دیکھنے کی کسے جرأت تھی؛ کسی نے اُن کی طرف تاکا، اور سَدا سُکھ نے اس کی گردن ناپ لی۔ پہلے مسافروں کے لئے وہاں کوئی ٹھیرنے کا مقام نہ تھا۔ اب آبادی سے ذرا ہٹ کر سَدا سُکھ کا جھونپڑا ہر ایک کے لئے کھلا تھا جیسے کسی عاشق کی آنکھ جو رات کو بھی بند نہیں ہوتی۔ یہ جگہ پہاڑ کے سادہ دل لوگوں کی طبیعت کے مانند سادہ تھی، لیکن مسافروں کی جو آؤ بھگت یہاں ہوتی تھی، اُس کی نظیر ملنا مُشکل ہے اور اس کی تہ میں کوئی ذاتی غرض، نام و نمود کی کوئی خواہش، تعریف و ثنا کی کوئی تمنّا نہ تھی۔ یہ وہ چندہ نہ تھا جو روزِ روشن کے وقت ہزاروں کی حاضری میں دیا جاتا ہے۔ یہ وہ امداد تھی جو شب کی تاریکی میں کی جاتی ہے۔ یہ وہ خدمت نہ تھی جو دُنیوی شہرت کمانے کے لئے کی جاتی ہے، یہ وہ نیکی تھی جو دریا میں ڈالی جاتی ہے +

سَدا سُکھ بہت امیر نہ تھے، اُنہیں ہر مہینے کے پہلے ہفتہ میں دو سَو روپے کا منی آرڈر آجاتا تھا۔ مگر اُن کا دل بادشاہ تھا۔ اپنے دروازے

سے کسی کو خالی ہاتھ نہ لوٹنے دیتے تھے۔ غریب مزدور، راہ گیر سادھو، بیکس عورتیں جو کوئی اُن کے رُوبرو دستِ سوال دراز کرتا وہ اُس کی دِل کھول کر امداد کرتے۔ ایسی دریادلی بڑے سے بڑے امیر آدمی کے حصّہ میں بھی نہ آئی ہوگی۔ گرانی کے ان پُرآشوب ایّام میں اس قلیل رقم سے نند اسکھ اتنا جس کیسے کما لیتے تھے۔ یہ کوئی نہ سمجھتا تھا۔ لوگ کہتے تھے یہ آدمی نہیں دیوتا ہے۔ چاہے تو مٹّی سے سونا بنا لے۔ یہ جو چاہے کر سکتا ہے +

بیج ناتھ کے مندر کے دیوتا پُرانے ہو گئے تھے۔ بھگوان نے نیا دیوتا بھیج دیا ہے اُن کی طرح اس دیوتا کا جسم بھی پتھّر کا سا ہے۔ مگر دل میں پرماتما کی جوت چلتی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہ دیوتا ہماری آنکھوں کے آنسو دیکھتے ہیں اور پھر بھی چُپ رہتے ہیں۔ شاید کلجگ نے اُن کے دِل کا درد چھین لیا ہے لیکن اس جیتے جاگتے دیوتا کا سینہ محبّت و ہمدردی کا سوتا ہے۔ یہ ہم کو روتے دیکھتا ہے تو خود بھی رونے لگتا ہے۔ ہمیں بیمار دیکھتا ہے تو بیتاب ہو جاتا ہے۔ وہ آسمان کے دیوتا ہیں یہ زمین کا فرشتہ ہے۔ وہ ہماری آنکھوں کے سامنے رہتے ہوئے بھی ہم سے الگ، ہماری تباہ حالیوں سے بے خبر رہتے ہیں۔ لیکن یہ دیوتا ہمارے کس قدر قریب، کتنا پاس ہے +

(۲)

رات کا وقت تھا۔ بیج ناتھ کے تاریخی مندر میں پجاری اپنی پوجا سے فارغ ہوا ہی تھا کہ اتنے میں دروازے پر آکر ایک موٹر لاری رُکی۔ اس میں سے دو عورتیں اُتر کر مندر میں داخل ہوئیں اور صحن میں بیٹھ گئیں۔ پجاری نے پُوچھا "مائی! کہاں سے آئی ہو"؟

عورت نے جواب دیا "مہاراج بڑی دُور سے"۔

"تمہارے ساتھ کوئی مرد نہیں"؟

"مرد بھگوان نے اپنے پاس بُلا لیا"۔

یہ کہتے کہتے اُس کی آنکھیں پُرنم ہو گئیں، اور اُس نے گردن جُھکا لی۔

"یہ لڑکی تمہاری کون ہے"؟

"یہ میری بیٹی ہے"۔

"تیرتھ کرنے نکلی ہو کیا"؟

"ہاں مہاراج! سوچا آدمی کا کیا بھروسہ ہے۔ کون جانے کس وقت جمراج بُلا بھیجے، دیوتوں کے درشن تو کر لیں"۔

پجاری نے آسمان کے تاروں کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"مائی! سچ ہے، پر آج کل تو دُنیا اندھی ہو گئی، پرلوک کا کسی کو دھیان ہی نہیں۔ اسی مندر میں پہلے اتنے جاتری آتے تھے کہ جگہ ملنا

مشکل تھا۔ اب سیر کرنے بہت آتے ہیں، تیرتھ کرنے کوئی بھی نہیں آتا"۔

عورت نے اِس کا جواب نہ دیا۔ تھوڑی دیر بعد بولی "کوئی کمرہ مِل جائے تو پڑ رہیں، صبح کو درشن کر کے چلے جائیں گے"۔

"کمرہ کیا کرو گی، یہیں برانڈے میں لیٹ رہو"۔

یہ کہہ کر پجاری چلا گیا۔ عورتیں کچھ دیر وہیں بیٹھی رہیں، اس کے بعد اُٹھ کر برانڈے میں چلی گئیں اور کپڑا بچھا کر لیٹ گئیں۔

صبح کو پجاری آیا، تو وہاں صرف لڑکی تھی، ماں نہ تھی، پجاری چونک پڑا۔ جیسے کسی کے سامنے بجلی چمک جائے، نوعمر لڑکی کو ماں اس پردیس میں نہیں چھوڑ جاتی۔ وہ اسے اتنا عزیز سمجھتی ہے جتنا اپنی جان کو، بلکہ اِس سے بھی زیادہ۔ ماں محبّت کا دُوسرا نام ہے اور محبّت بلا وجہ ایسی بے وفائی نہیں کرتی، اس نے ضرور کوئی بڑا بھاری گناہ کیا ہوگا کوئی ناقابل عفو قصور، ایسی ہی حالت میں ماں کا شیشۂ دل پتّھر بن سکتا ہے، ورنہ نہیں۔ لڑکی رو رہی تھی اُس کے دلخراش نالے سُن کر پتّھروں میں بھی سوراخ ہوئے جاتے تھے۔ سوچتی تھی کیا کروں گی، یہاں میرا کون ہے، اِس پردیس میں میری بانہہ کون پکڑے گا۔ مجھے یہاں کس کا سہارا ہے، وہ چاروں طرف دیکھتی تھی، آدمی بہت تھے، مگر ہمدردی کسی میں بھی نہ تھی۔ ایک غریب لڑکی پردیس میں روتی تھی

اور لوگ کھڑے مُنہ تکتے تھے۔ کسی میں اتنا بھی حوصلہ نہ تھا کہ آگے بڑھ کر اُسے چُپ ہی کرائے۔ اُن کے پاس اُس بدنصیب کے لئے محبّت و ہمدردی کے دو کلمے بھی نہ تھے ؛

اِتنے میں سَدا سُکھ آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ لوگوں نے رستہ چھوڑ دیا۔ وہ آکر کھڑے ہوگئے، اور لڑکی کی طرف دیکھ کر بولے :۔

"کیوں، اِسے کیا ہُوا ہے ؟"

پُجاری نے سَدا سُکھ کی طرف پُر معنی انداز سے دیکھا اور جواب دیا "اِس کی ماں اِسے یہاں چھوڑ گئی ہے، اب بیچاری رو رہی ہے کیا کرے کیا نہ کرے" ؛

سَدا سُکھ کی آنکھیں آبگوں ہوگئیں، آہ سرد بھر کر بولے "وہ ماں نہ ہوگی، ڈائن ہوگی، اگر ماں ہوتی تو جوان بیٹی کو یوُں موت کے مُنہ میں دھکّا نہ دے جاتی" ؛

ایک آدمی نے آہستہ سے کہا "مگر مہاراج! شاید یہ بیٹی ہی بیٹی نہ ہو دشمن ہو، ماں کا کلیجہ بھی یوُں ہی پتھّر نہیں ہو جاتا، ضرور کوئی وجہ ہوگی" ؛

پہاڑ کے رہنے والے سیدھے سادے ضرور ہوتے ہیں، مگر ننگ و ناموس کی باتوں کو وہ بھی خوب سمجھتے ہیں۔ اس فقرہ کے

معنی فی الفور سب پر روشن ہو گئے۔ وہ ایک دُوسرے کی طرف استفسار بھری نگاہوں سے دیکھنے لگے، گویا زبان حال سے کہہ رہے تھے، یہ داغ رُسوائی کہاں سے آگیا۔ بڑی مشکل پڑی۔ چھوٹی سی بستی ہے، یہاں یہ گُناہ ایک دن بھی پوشیدہ نہ رہ سکے گا۔ لیکن سَدا سُکھ کا یہ خیال نہ تھا، وہ سوچتے تھے، یہ کرتے کیا ہیں؟ اب اگر کسی سے ایک مرتبہ غلطی ہو گئی تو کیا اُسے اصلاح کا موقعہ نہ دیا جائے اور پھر یہ بھی تو ممکن ہے کہ گنہگار کوئی دُوسرا ہی ہو۔ اور پھر یہ لوگ خود کہاں کے دیوتا ہیں۔ ہم دُوسروں کے گُناہ بڑی جلدی دیکھ لیتے ہیں، اپنی طرف ہمارا خیال ہی نہیں جاتا۔ سَدا سُکھ نے ان سب کی طرف دیکھا۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح کوئی گدا گر کسی امیر کی طرف دیکھتا ہے، اور کہا "بھائیو! یہ وقت ایسی باتوں کا نہیں جلتے ہوئے گھر کی آگ بُجھا نہیں سکتے تو اِس پر تیل بھی تو نہ چھڑکو۔ یہ مصیبت زدہ ہے، اس کی مدد کرو، اس کا ہاتھ تھامو، اِسے سہارا دو، بولو اسے اپنے یہاں کون رکھے گا؟"

لوگ ایک دُوسرے کا مُنہ تکنے لگے۔ وہ حیران تھے، کہ سَدا سُکھ کو کیا ہو گیا ہے، جو ہمیں ایک بدکردار لڑکی کو اپنے گھر میں رکھنے کو کہتا ہے۔ یہی لفظ اگر کسی دُوسرے شخص کے مُنہ سے نکلتے تو وہ پنجے جھاڑ کر اُس کے پیچھے پڑ جاتے، مگر یہ سَدا سُکھ تھا جس کے سامنے کسی کو سر

اُٹھانے کی بھی جُرأت نہ تھی۔ سب دم بخود کھڑے تھے، جیسے کسی کے مُنہ میں زبان ہی نہ تھی ×

سَدا سُکھ نے ایک ایک کر کے سب کے چہروں کی طرف دیکھا۔ مگر کوئی بھی رضامند نہ تھا۔ تب اُنہوں نے بے بسی کی آہِ سرد بھری اور کہا۔ "چل بیٹی! میرا جھونپڑا تیرے لئے کھُلا ہے، مدّت ہوئی میری بھی ایک بیٹی تھی، آج اُس کی ہڈیاں بھی گنگا کے پانی میں گھُل چکی ہونگی، مَیں سمجھونگا مجھے وہی بیٹی پھر مل گئی" ×

روتی ہوئی لڑکی کے آنسو تھم گئے، اُس نے حیرت سے سَدا سُکھ کے چہرے کی طرف دیکھا اور ڈر گئی۔ وہ سمجھ نہ سکی کہ یہ شخص راچھس ہے یا دیوتا، شکل راچھسوں کی سی تھی، آواز دیوتاؤں کی سی، وہ اُس کے پاس رہنا نہ چاہتی تھی، یہ شخص کیسا ہے کیسا نہیں، اس کے پاس اکیلی کیسے رہوں گی۔ یہ سوچ کر اُس نے سر جھُکا لیا، اور بھرّائی ہوئی آواز میں بولی "آپ جائیے، میرے ڈوبنے کے لئے ناسے کا پانی بہت ہے" ×

سَدا سُکھ نے اپنے مخصوص شیریں لہجہ میں کہا "بیٹی! ڈوبنے کی کیا ضرورت ہے، جب تک مَیں زندہ ہوں تب تک تجھے ذرا بھی تکلیف نہ ہوگی۔ چل کر اپنا گھر سنبھال۔ آج تو میری بیٹی ہے" ×

بے غرض محبت دل کو موہ لیتی ہے۔ لڑکی کے دل میں ہلچل مچ گئی۔

یہ لہجہ گناہ کا لہجہ نہ تھا، نہ اس میں تصنع اور بناوٹ کی آمیزش تھی یہ ایک راست گو اور حق پسند آدمی کے پاکیزہ جذبات تھے جو دل سے نکلتے ہیں دل پر اثر کرتے ہیں۔ لڑکی کو اپنا مرا ہوا باپ یاد آگیا، وہ بھی اِسی طرح بولتا تھا، اُس کی آواز میں بھی یہی شیرینی، یہی موہنی تھی وہ بھی اُس سے اسی طرح اصرار کیا کرتا تھا، آج وہ کہاں چلا گیا؟ لڑکی کا دل بھر آیا۔

وہ انکار نہ کرسکی، تھوڑی دیر بعد لوگوں نے حیرت کے ساتھ دیکھا کہ سَدا سُکھ ایک گٹھری اُٹھائے اپنے جھونپڑے کو جا رہے ہیں اور ان کے پیچھے پیچھے وہ لڑکی ہے۔

(۳)

اِس لڑکی کا نام بھگوتی تھا، گو بہت خوبصورت نہ تھی۔ مگر بدصورت بھی نہ تھی، گورا رنگ تھا موٹی موٹی آنکھیں۔ گول چہرہ، عُمر اُنیس بیس سال کے لگ بھگ ہوگی۔ سَدا سُکھ کے جھونپڑے میں آنے کے بعد اُسے کوئی تکلیف نہ ہوئی۔ لیکن وہ پھر بھی ہمیشہ رنجیدہ رہتی تھی۔ محبت کی اِس آگ کو کون بجھا سکتا تھا جو اُس کے دل میں جلا کرتی تھی، بیٹھے بیٹھے رونے لگتی جیسے کوئی بسری ہوئی بات یاد آجائے۔ سَدا سُکھ پوچھتے تجھے کیا غم ہے۔ مگر بھگوتی اپنی موٹی موٹی متحیر آنکھوں سے اُن کی طرف دیکھتی اور آہ سرد بھر کر سر جھکا لیتی۔

اسی طرح دو مہینے گزر گئے۔ بھگوتی کے ہاں لڑکا پیدا ہوا۔ اب سدا سکھ کی ہر جگہ بدنامی ہونے لگی۔ لوگ کہتے دیکھا بڑے مہاتما بنے پھرتے ہیں۔ سارا پول کھل گیا۔ کوئی شریف آدمی ایسی عورت کا منہ بھی نہ دیکھتا آخر مائی یوں تھوڑا ہی چھوڑ گئی ہے۔ ان مہاتما نے یہ بھی نہ سوچا کہ دُنیا کیا کہے گی؟ لیکن سدا سکھ کو ان جگر [illegible] ذرا بھی پروا نہ تھی۔ وہ صرف یہ سوچتے تھے کہ یہ یتیم لڑکی ہے، اس کے ماں باپ نہیں۔ اس کے ساتھ کسی شاطر نے بیوفائی کی ہے۔ اس کے دل کو ٹھیس نہ لگے۔ بیج ناتھ کے لوگ اُن کے سایہ سے بھی پرہیز کرتے تھے۔ نہ اُن سے کوئی ملنے آتا نہ ہنس کر بات کرتا۔ جیسے اُن سے کوئی گُناہ عظیم سرزد ہو گیا ہو۔ ایسی نفرت کوئی چور اور ڈاکو سے بھی نہ کرتا ہوگا۔ البتہ آتے جاتے مسافر اب بھی وہیں ٹھہرتے تھے۔ اُن کی خاطر تواضع اب بھی اُسی جوش اُسی محبت، اُسی عقیدت سے ہوتی تھی۔ ہاں فرق صرف یہ تھا کہ پہلے یہ کام سدا سکھ اپنے ہاتھ سے کرتے تھے، اب بھگوتی کے سپرد تھا۔ سدا سکھ اب سارے سارے دن بھگوتی کے لڑکے کو کھلایا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ رات کو بھی اپنے ساتھ سُلاتے، اُس کا منہ دیکھ کر اُن کی آنکھیں چمکنے لگتی تھیں، اُس کی طفلانہ شرارتوں پر اُنہیں کبھی غصہ نہ آتا تھا۔ کیا مجال اُس کی کوئی بات

ٹل جائے۔ جو چاہتا وہی ہوتا، جو مانگتا وہی لیتا۔ بھگوتی کہتی تھی آپ اسے اتنا سر پر نہ چڑھائیں۔ بڑا ہو کر تنگ کرے گا۔ لیکن سَدا سُکھ کہتے، بھئی! مجھ سے اس کی آنکھ میں آنسو نہیں دیکھے جاتے، یہ رونا سا مُنہ بناتا ہے، تو میرے سینہ میں ہل چل مچ جاتی ہے مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہ کہتا ہے۔ جب تم بچّے تھے، تم بھی اسی طرح کرتے ہوگے آج بڑے ہو گئے تو بچّوں کی بات ہی نہیں سُنتے۔ نہ بھئی! مجھ سے تو یہ نہ ہو گا۔ آج ہم اس کا من رکھتے ہیں، کل یہ ہمارا من رکھے گا بھگوتی اس کا جواب کیا دیتی، صرف مُسکرا کر اتنا کہہ دیتی، بگاڑ لیجئے آپ ہی کو تنگ کرے گا۔ رامو معصومانہ انداز سے سر ہلا ہلا کر جواب دیتا۔ ہاں کلوں دا (کروں گا) سَدا سُکھ کھانا کھاتے، رامو اُن کی گود میں بیٹھا اُن کی ڈاڑھی سے کھیلتا، کبھی کہتا۔ بابا! پہلے کاوگ کا جہاز بنا دے۔ ذرا دیر ہو جاتی تو کہتا، بابا تتان! ہوتی کاتا ہے کام نہیں کرتا ہے، گھر سے نکال دیں گے، بھگوتی ٹیڑھی آنکھوں سے دیکھتی تو کہتا، تو بھی تتان، تُجھے بھی نکال دیندے (تو بھی شیطان تجھے بھی نکال دیں گے) بھگوتی کہتی، تو پاجی۔ رامو جھٹ جواب دیتا۔ ہم لاجہ بابا پادی، بابا تتان (ہم راجہ! بابا پاجی! بابا شیطان!!) اور یہ کہتے کہتے سَدا سُکھ کے پیچھے جا کر چھپ جاتا اور اُن کے کندھے پر سے

سر نکال کر ہنس ہنس کر کہتا۔ اب گیتے مار لے گی، ہم بابا دی پاس چھ ہیں (یعنی اب کیسے مار رہے گی، ہم بابا کے پاس ہیں) ۔

سُندُ اسکھ کے لئے عہدِ طفلی کی یہ معصومانہ باتیں ایسی موہنی تھیں جیسے عالمِ شباب میں نوجوانوں کے لئے عشق کی پُر لطف داستانیں بھی نہ ہوں گی۔ وہ ان میں کھوئے سے جاتے تھے۔ اُن کو اپنا آپ بھول جاتا تھا۔ اُن کو یہ بھی خیال نہ رہتا تھا۔ کہ اب میں بُڈھا ہو گیا ہوں کوئی دیکھے گا تو کیا کہے گا۔ کبھی رامو کو پیٹھ پر سوار کر کے گھوڑا بنتے کبھی بھالو کی طرح ناچ کر اُس کا جی بہلاتے۔ کبھی اس کے اصرار پر اپنے سر پر کاغذ کی ٹوپی پہنتے۔ کبھی بلّی کی طرح میاؤں میاؤں کرتے اور اُسے حیران کرتے۔ بے غرض محبّت کے یہ پاکیزہ منظر دیکھ کر مجبور بھگوتی کے دل پر وجدانی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ اس کی آنکھ میں آنسو بھر آتے تھے۔ سوچتی۔ اگر یہ نیک دل فرشتہ یہاں نہ ہوتا تو میری کیا حالت ہوتی۔ کون کھلاتا پلاتا، کون حفاظت کرتا۔ بچّے کو اس طرح آنکھ کی پتلی بنا کر کون رکھتا۔ کبھی خیال آتا، اگر ان کو کچھ ہو جائے تو میرا کون ہے، ماری ماری پھروں، کوئی سیدھے مُنہ بات بھی نہ کرے۔ اس خیال کے آتے ہی بھگوتی کو ایسا معلوم ہوتا جیسے چاروں طرف تاریکی ہے، جیسے وہ دُنیا میں یکہ و تنہا رہ گئی ہے جس کا

کوئی بھی مددگار نہیں۔ اِس خیالی انتشار سے بھگوتی کی آنکھوں میں آنسو آجاتے تب وہ اپنا سر گھٹنوں پر رکھ لیتی، اور خلوص دل کے ساتھ پرماتما سے بڈھے سدا سنگھ کی سلامتی کے لئے رو رو کر پرارتھنا کرتی ٭

(۴)

اِسی طرح چھ سال کا عرصہ گزر گیا۔ مگر سدا سنگھ کو ایسا معلوم ہوتا کہ یہ چھ سال نہ تھے، چھ دن تھے، کتنی جلدی گزر گئے، جیسے تیر کمان سے نکل جاتا ہے۔ ابھی کل ہی کا ذکر ہے، بھگوتی اِس جھونپڑے میں آئی ہے۔ اِتنی جلدی چھ سال کیونکر گزر گئے۔ کچھ پتہ بھی نہیں لگا۔ سدا سنگھ کو بڑھاپے میں بیٹی کی پاکیزہ محبت ملی۔ اس کی خوشی کا ٹھکانہ نہ تھا۔ اُس کو بھگوتی اور رامو نہیں بھولتے تھے۔ اُس کے اُجڑے ہوئے چمنستان دل میں پیار کی بہار آگئی تھی۔ اُس کی رُوح کی خشک ندی میں برسات کی باڑھ آگئی تھی۔ لیکن تقدیر کے فرشتے اُس کے لئے کچھ اور ہی سوچ رہے تھے ٭

ایک دن رامو نے ہٹ کی۔ کہ ہم تو بندوق لیں گے۔ بازار میں کسی لڑکے کے پاس دیکھ آیا تھا۔ گھر آکر سدا سنگھ سے لڑنے لگا۔ سدا سنگھ بہتیرا سمجھاتے تھے۔ لیکن بچپن کے پاس وہ کان کہاں جو

بُڑھاپے کی نصیحت سُنیں۔ رامو روتا تھا اور کہتا تھا۔ ہم بندوق ہی لیں گے۔ اُٹھو جا کر لاؤ۔ ورنہ ہم کھانا نہیں کھائیں گے، کبھی کہتا ہم تُم سے بولنا ہی بند کر دیں گے۔ کبھی کہتا رات کو تمہارے ساتھ نہیں سوئیں گے۔ پھر کہانیاں کس کو سُناؤ گے؟ کبھی کہتا ہم تمہارا بیٹا نہیں بنیں گے، پیار کس کو کرو گے۔ کس مزے سے کہتے ہیں، رامو ہمارا راجہ بیٹا ہے۔ سَدا سُکھ اور بھگوتی ہنسی سے لوٹے جاتے تھے، اور کہتے تھے، دیکھو تو کیا کیا دھمکیاں دے رہا ہے، گویا راج ہی چھین لے گا۔ اتنے میں رامو پیچھے سے آ کر سَدا سُکھ کی پیٹھ پر آ کر گر پڑا، اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ یہ اُس کا آخری ہتھیار تھا اب سَدا سُکھ سے ضبط نہ ہو سکا۔ بولے "بیٹی! یہ تو آنکھیں خراب کر لے گا، کہو تو کانگڑہ چلا جاؤں، شام تک لوٹ آؤں گا۔ بچہ ہے دو روپے کی بندوق پا کر ناچتا پھرے گا"۔

بھگوتی نے سَدا سُکھ کی طرف محبّت سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"بابا بچّوں کو اتنا سر پر بھی نہ چڑھانا چاہیئے۔ اب ذرا سی بات کے لئے اِتنی دُور جاؤ گے"۔

سَدا سُکھ ۔ لاری میں بیٹھ جاؤں گا۔ کون سے چھپّن ٹکے خرچ ہو جائیں گے"۔

بھگوتی:۔ "لیکن اس کی ضرورت ہی کیا ہے"؟
سُندر اُسکھ:۔ "روتا رہے گا، سارا دن چپ نہ ہوگا"۔
بھگوتی:۔ "روتا رہے گا، روتا رہے، اس سے کیا؟ یہ بھی کوئی بات ہے کہ ہم اس کی ہر ایک بات پوری کریں۔ آج بندوق کے لئے روتا ہے۔ کل جہاز کے لئے مچلے گا"۔
سُندر اُسکھ:۔ "یہ روتا ہے، تو میرے دل میں کچھ ہونے لگتا ہے۔ مجھ سے رہا نہیں جاتا"۔
بھگوتی:۔ "آپ کی انہی باتوں نے تو اس کو بگاڑ دیا ہے۔ پہلے مجھ سے ڈرتا تھا۔ اب مجھ سے بھی نہیں ڈرتا، کل کہتا تھا۔ یہ گھر میرا اور میرے بابا کا ہے۔ اگر بہت بولی تو گھر سے نکال دوں گا"۔
سُندر اُسکھ (ہنس کر) "ارے ماں سے ایسی باتیں!"
لیکن راہو تو دوسری بات ہی نہ سنتا تھا۔ سُندر اُسکھ کے اوپر گر کر بولا۔ اُٹھو بھی۔ جا کر بندوق لا دو۔
سُندر اُسکھ کو جیسے اورشہ مل گئی۔ آہستہ سے بولے "بیٹی! اب جانے ہی دو۔ یہ بندوق لئے بغیر کبھی نہ مانے گا"۔
یہ کہتے کہتے سُندر اُسکھ کھڑے ہو گئے، اور صندوق سے کچھ روپے لے کر باہر نکل گئے۔ بھگوتی وہیں اُسی طرح زمین پر بیٹھی رہ گئی گویا

کسی نے اُٹھنے کی طاقت سلب کر لی ہو۔ سوچتی تھی اسے ہم سے کتنی محبت ہے ضرور یہ پچھلے جنم میں یہ میرا باپ ہو گا۔ ورنہ ایسی محبت کبھی نہ ہوتی۔ مجھے تو اب بھی شُبہ ہوتا ہے کہ قُدرت نے میرا مرا ہُوا باپ زندہ کر دیا ہے +

شام کو سَدا سُکھ لوٹے تو بے حد خوش تھے، وہ صرف رامو کے لئے بندُوق ہی نہ لائے تھے۔ بھگوتی کے لئے دھوتی جوڑا۔ سلیپر اور ایک لوئی بھی خرید لائے تھے۔ باپ شہر گیا تھا بیٹی کے لئے کچھ خریدے بغیر کیسے آجاتا یہ چیزیں معمولی تھیں، معمولی حالت میں ان کی خاص اہمیت بھی نہ تھی مگر اُن کو جس شوق جس محبت پدری سے سَدا سُکھ نے خریدا تھا وہ اِس خود غرض، پست خیال دُنیا میں کہاں ہے؟ سوچتے تھے رامو بندُوق لے کر کیسا خوش ہو گا، اُس کی آنکھیں چمکنے لگیں گی آکر گلے سے لپٹ جائیگا۔ جب تک نیند نہ آجائے گی اُسی کی باتیں کرے گا۔ عجب نہیں رات کو بھی ساتھ لے کر سوئے۔ بھگوتی کو ہاتھ بھی نہ لگانے دے گا۔ پھر سوچتے۔ بھگوتی اپنی چیزیں دیکھ کر کہے گی۔ بابا! یہ کیا لے آئے، اب تم فضول خرچ ہوتے جاتے ہو لیکن اُس کے دل میں جو سرور، جو فخر، ہو گا اُسے دُنیا کا بڑے سے بڑا شاعر بھی بیان نہیں کر سکتا +

شام ہو گئی تھی، رات کا اندھیرا پہاڑ کی سونی سڑکوں پر اندر بکھرے

ہوئے جھونپڑوں کو اپنی آغوش میں لینے کے لئے بیتاب، دیوانہ وار بڑھا آتا تھا کہ اتنے میں سُدا سُکھ اپنے جھونپڑے کے سامنے جا پہنچے، اُن کو خیال تھا بھگوتی اور رامو دروازے پر کھڑے میرا رستہ دیکھ رہے ہونگے۔ لیکن وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ سَدا سُکھ اُداس ہو گئے۔ اُن کو دروازے پر پاکر سُدا سُکھ کے دل کا کنول شگفتہ ہو جاتا، سوچنے لگے مَیں خواہ مخواہ مُرا جاتا ہوں اُن کو میرا ذرا بھی خیال نہیں۔ لاکھ کوشش کرو مگر جو بیگانہ ہے وہ اپنا کیسے ہو جائیگا۔ پھر خیال آیا بھگوتی بیمار نہ ہو گئی ہو یا رامو ہی کہیں نالے میں نہ گر گیا ہو۔ سَدا سُکھ کا دل دھڑکنے لگا۔ لپکے ہوئے جھونپڑے کے اندر چلے گئے۔ لیکن وہاں جو کچھ دیکھا اُس پر اُنہیں اعتبار نہ آیا۔

چارپائی پر کوئی مرد لیٹا تھا اور اُس کے پاس ہی پائنتی کی طرف بیٹھی ہوئی بھگوتی محبت کی پیاسی نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ سَدا سُکھ کے پَیر وہیں رُک گئے۔ جیسے اُن میں کسی نے بیڑیاں ڈال دی ہوں جیسے کسی نے اُن کو جادُو کے زور سے پتھّر بنا دیا ہو، وہ سانس روک کر وہیں کھڑے رہ گئے۔ اتنے میں مرد نے بھگوتی کا ہاتھ پکڑ کر ایک آہ سرد بھری اور کہا۔ یہ سب کچھ درست ہے، مگر تمہیں میرا کہا کرنا ہی ہو گا، ورنہ سمجھ لو نالے میں ڈُوب مروں گا۔

(۵)

سَدا اُسکھ کی آنکھوں سے آگ کے شرارے نکلنے لگے، انہوں نے جو چیزیں خرید کر لائے تھے وہ زمین پر رکھ دیں۔ اپنے ہاتھ کی پہاڑی لکڑی کو زور سے پکڑا، پھر ایک قدم آگے بڑھے، اور سخت لہجہ میں بولے:۔

"تو کون ہے؟"

بھگوتی نے چونک کر مُنہ پر کپڑا کھینچ لیا، مرد اُٹھ کر زمین پر کھڑا ہو گیا مگر اُس کے چہرے پر فکر و تردد کے کوئی آثار نہ تھے۔ اُس نے نہایت عقیدت سے دونوں ہاتھ باندھے، اور سَدا اُسکھ کو نمسکار کر کے جواب دیا:

"میرا نام کیلاش ناتھ ہے"۔

سَدا اُسکھ (اُسے تحیّر کی نگاہوں سے دیکھ کر) "کون کیلاش ناتھ! تمہارا گھر کہاں ہے؟"

کیلاش ناتھ "وہ غریب خانہ لکھنئو میں ہے (تھوڑے وقفہ کے بعد) آپ کی تعریف سُنی تھی۔ سچ مچ آپ آدمی نہیں، دیوتا ہیں"۔

سَدا اُسکھ نے ایک دفعہ بھگوتی کی طرف دیکھا، اور جواب دیا "مگر تم کو مغالطہ ہوا ہے۔ مَیں روپیہ لُٹاتا ہوں، عزّت نہیں لُٹاتا۔ میرے لئے روپیہ کچھ بھی نہیں غیرت سب کچھ ہے"۔

کیلاش ناتھ چُپ چاپ کھڑے رہے۔

سَدا سُکھ:۔ یہ ایک شریف بڈّھے کا جھونپڑا ہے، کسی بھڑوے کا مکان نہیں۔ بولو تم یہاں کس غرض سے آئے ہو، اِس لڑکی کو پھسلانے کے لئے موقعہ تاڑ رہے ہو گے، آج میدان خالی پایا۔ چلے آئے۔ کیوں؟

بھگوتی رونے لگی۔

کیلاش نے سر جھکا کر جواب دیا "کس مُنہ سے کہوں، مَیں وہی گنہگار ہوں جس کی بدولت یہ معصوم اِس تباہی کی حالت میں ہے، مگر میرا اِس میں ذرا بھی قصور نہیں۔ مَیں نے والدین سے بہت کہا پر اُنہوں نے میری ایک نہ سُنی، اب اُن کا انتقال ہو گیا ہے۔ پتہ لے کر حاضر ہو گیا ہوں۔ آپ یہ سُن کر خوش ہونگے کہ مَیں نے اب تک شادی نہیں کی۔ والدین نے کہا بیاہ کر لو لیکن مَیں نے صاف کہہ دیا کہ میرا بیاہ ہو چکا ہے، رسم ادا نہیں ہوئی تو اس سے کیا، دِل تو مل چکے ہیں مَیں اسے ہی بیاہ سمجھتا ہوں"۔

بھگوتی اُٹھ کر آہستہ آہستہ اندر چلی گئی۔ سَدا سُکھ نے کچھ سوچ کر پُوچھا "تم مجھے چکمہ تو نہیں دے رہے، مجھے اِس پر یقین نہیں آتا"۔

کیلاش ناتھ:۔ مَیں جو کچھ عرض کرتا ہوں اِس میں ایک حرف بھی غلط نہیں اگر ہو تو آپ میری گردن کاٹ لیں۔ کیا مجال جو اُف بھی

کرجاؤں، اپنے مُنہ سے کیا کہوں۔ میرے پاس کھانے پینے کی کمی نہیں۔ بھگوان کا دیا سب کچھ ہے۔ چار پانچ سو روپیہ ماہوار کی آمدنی ہے۔ بیاہ کرنا چاہوں تو آج کرلوں۔ پھر بھی یہاں دَوڑ آیا ہوں۔ آخر کچھ تو مجھے اس کا خیال ہوگا"۔

سَدَا سکھ۔ "چھ سال کے بعد تمہیں اس کی سُدھ آئی، پہلے کہاں سوتے تھے؟"

کیلاش۔ "والد مرحوم کہتے تھے، کہ اگر تُم نے اِس کا مُنہ بھی دیکھا تو جائداد سے عاق کردیں گے"۔

سَدَا سکھ۔ "اور خط لکھنے میں کونسا امر مانع تھا؟ دو لفظ لکھ کر بھیجتے تو اسے تسلّی رہتی"۔

کیلاش۔ "مجھے ان کا پتہ بھی معلوم نہ تھا"۔

سَدَا سکھ نے لاٹھی ہاتھ سے رکھ دی اور آہ سرد بھر کر کہا۔ "جانتے ہو اس نے کتنی تکلیفیں اُٹھائی ہیں"۔

کیلاش۔ "پرماتما نے زندہ رکھا تو اب سے انہیں گرم ہوا بھی نہ لگے گی"۔

سَدَا سکھ۔ "رات دن روتی تھی"۔

کیلاش۔ "وہ تو چہرہ ہی کہہ رہا ہے"۔

سَدَا سکھ۔ "پہلے سے آدھی بھی نہیں رہی۔ جب میں نے اسے پہلے دن

دیکھا ہے اُس دن رنگ رُوپ ہی اَور تھا"۔

کیلاش:۔ آپ رنگ رُوپ کی کہتے ہیں، مَیں کہتا ہوں بچ گئی ہے، یہی غنیمت ہے"۔

سدا سُکھ:۔ تو آپ اسے لینے آئے ہیں، کیوں؟ لیکن آپ کی برادری اسے قبول کرے گی۔ اگر کسی نے ایک سخت لفظ بھی کہہ دیا تو اس سے برداشت نہ ہو گا۔ اتنا سوچ لو"۔

کیلاش:۔ مَیں نے برادری کے سب آدمیوں سے کہہ دیا ہے، گھر کے لوگ بھی مان گئے ہیں۔ جو نہ مانے گا اُس سے تعلق ہی نہ رکھوں گا۔ مجھے پہلے یہ ہے پیچھے کوئی اَور۔ آپ ذرا فکر نہ کریں"۔

کیلاش ناتھ:۔ آپ بھی چلئے، وہ کہتی ہے بابا نہ جائیں گے، تو مَیں بھی نہ جاؤں گی"۔

سدا سُکھ کی آنکھوں میں پانی آ گیا:۔ بیٹا! اس کی باتیں نہ سُنو، یہ تو پگلی ہے۔ تم خود ہی سوچو۔ میرا وہاں جانا کیا ٹھیک ہے؟"

کیلاش:۔ ایک مرتبہ نہیں ہزار مرتبہ ٹھیک ہے، مَیں آپ کو یقین دلاتا ہوں وہاں آپ کو ذرا بھی تکلیف نہ ہو گی"۔

اتنے میں رامو آ گیا، اس کے ہاتھ میں کیلاش کے دیئے ہوئے کھلونے تھے۔ یہ کھلونے کیسے خوبصورت تھے، کتنے بیش قیمت۔ رامو نے سدا سُکھ کو

ایک ایک کھلونا دکھاتا تھا اور جھومتا تھا، گویا زبانِ حال سے کہتا تھا۔ دیکھا ہمارے پاس کیسی کیسی چیزیں ہیں۔ سندر سنگھ کہتے تھے، واہ بھئی واہ! یہ کھلونے تو بہت خوبصورت ہیں، یہاں ایسے خوبصورت کھلونے کسی کے پاس بھی نہ ہوں گے۔ کہاں سے آئے ہیں یہ؟"

رامو (منہ پھلاکر) "دلّی سے"

سندر سنگھ۔ "ارے! جبھی ایسے خوبصورت ہیں"

رامو۔ (خوش ہوکر) "ہاں! یہ بھالو بھی دلّی سے آیا ہے، یہ پالکی بھی دلّی سے آئی ہے (کیلاش بابا کی طرف دیکھ کر) بابا تم کہاں سے آئے ہو؟"

کیلاش ناتھ کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ سندر سنگھ نے جواب دیا "ہم کانگڑے سے آئے ہیں"

کانگڑے کا نام سنتے ہی رامو کو بندوق کی یاد آگئی، سندر سنگھ کی گود میں کھڑا ہو کر بولا "ہماری بندوق کہاں ہے، لاؤ"

سندر سنگھ۔ "اب بندوق لے کر کیا کروگے، رہنے دو"

رامو۔ (سوچ کر) "ہم بندوق سے اِس بھالو کو ماریں گے، لاؤ"

یہ کہتے کہتے رامو نے اپنے باپ کی طرف سہمی ہوئی نگاہوں سے دیکھا یعنی دیکھنا چاہا کہ بھالوان کا ہے، اُسے مارنے سے یہ خفا تو ہو گئے لیکن وہاں خفگی نہ تھی، اُلٹا وہ مسکرا رہے تھے۔ رامو شیر ہو گیا، آن واحد میں

اُس نے سُندا سُنگھ سے بندوق لے لی اور بھالو کا شکار کرنے لگا کیلاش ناتھ اپنے چھوٹے سپاہی کے شکار کا تماشہ دیکھتے تھے اور پھولے نہ سماتے تھے اُن کے سینے میں محبّت پدری اِس طرح لہریں مارتی تھی جیسے چاندنی رات میں سمندر لہریں مارتا ہے لیکن سُندا سُنگھ کے خانۂ دل میں گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ سوچتے تھے، کیا سچ مچ اب یہ چلے جائیں گے۔ یہ محبّت، یہ سادگی، یہ طفلی کے من کو موہ لینے والے کھیل سب خواب و خیال ہو جائیں گے۔ رات کو کوئی اپنا بات کرنے والا بھی پاس نہ ہوگا۔ سُوکھا ہُوا باغ پانی کے چند چھینٹوں سے لہلہا اُٹھا تھا، کیا اب وہ پھر اُسی طرح سُوکھ جائیگا۔ خُشک ندی برسات کے پانی سے ٹھاٹھیں مارنے لگی تھی۔ کیا اب وہ پھر اُسی طرح خُشک ہو جائے گی۔ سُندا سُنگھ کی آنکھوں سے گرم پانی کے دو قطرے ٹپک پڑے۔

لیکن جب چار پانچ دن کے بعد روانگی کی صُبح آئی تو سُندا سُنگھ کے چہرے پر ذرا بھی انتشار نہ تھا، گویا بھگوتی کے جانے کا اُنہیں ذرا بھی دُکھ نہیں، پر بھگوتی کی آنکھیں سُوج گئی تھیں، وہ ساری رات روتی رہی تھی۔ بار بار کہتی تھی "بابا! وہاں میرا جی نہ لگے گا، مجھے وہاں نہ بھیجو یہ جھونپڑا مجھے راج محلّوں سے بھی بڑھ کر ہے۔

بعض وقت ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے میرا تیرتھ راج ہے۔ یہاں آکر میں دُنیا بھر کے دُکھوں سے محفوظ ہو گئی۔ ایسا آرام دل ... اطمینان قلب مجھے کہیں بھی میسّر نہ ہوگا۔ موٹر میں بیٹھتے وقت بھی اُس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے اُدھر رامو روتا تھا اور کہتا تھا، بابا! تم بھی میرے پاس بیٹھو! کیلاش نے کہا آپ بھی چلے آئیے، ہم آپ کو ذرا بھی تکلیف نہ ہونے دینگے۔ کیا آپ کو ہم پر اعتبار نہیں"؟

سندر سنگھ "اعتبار تو ہے مگر میں نے بھگوتی کو بیٹی سمجھا ہے، میں ہندو ہوں، بیٹی کے گھر کیسے چلا جاؤں، دُنیا جینے نہ دے گی"۔

کیلاش "آپ دُنیا کی پرواہی کیوں کریں، بکنے دیں"۔

سندر سنگھ "مگر اپنا دل بھی تو نہیں مانتا"۔

کیلاش "دیکھئے ماں بیٹا دونوں رو رہے ہیں"۔

سندر سنگھ "تم سمجھا دینا آخر بیٹی کو اپنے گھر جانا ہی پڑتا ہے۔ مجھے تو آج بیحد خوشی ہے کہ یہ اپنے گھر جا رہی ہے۔ پرماتما کرے اسے کوئی تکلیف نہ ہو۔ بیٹا! یہ لڑکی ہیرا ہے اس کے دل میں چھل کپٹ نہیں ہے، نہ اسے بناوٹ آتی ہے۔ میری ... سے یہ درخواست ہے کہ اس کا دل نہ دُکھانا، اور کیا کہوں"؟

کیلاش ناتھ نے کہا "اس امر کی طرف سے آپ مطمئن رہیں، اور

ہاں خط لکھتے رہئے گا"۔

سَدا سُکھ "اور تم گرمیوں میں ضرور چلے آنا، لکھنؤ میں ایسی ٹھنڈی ہوا کہاں ملے گی؟"

بھگوتی نے دھوتی سے منہ پونچھ کر کہا "ضرور آئیں گے، آپ نہ کہیں جب بھی آئیں گے"۔

سَدا سُکھ "یہ تمہارا اپنا گھر ہے"۔

موٹر چلا اور دیکھتے دیکھتے دُور نکل گیا، اب سَدا سُکھ سے ضبط نہ ہو سکا۔ وہیں کھڑے روتے رہے اور موٹر کی طرف دیکھتے رہے۔ یہاں تک کہ موٹر پہاڑ کے چکّر دار رستوں میں گُم ہو گیا۔ مگر اُن کو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے رامو کے رونے کی آواز اب بھی آ رہی ہے، جیسے بھگوتی سسکیاں بھر رہی ہے۔ اُس رات سَدا سُکھ بہت غمگین، بہت اُداس تھے۔ وہ سادھو آئے ہوئے تھے۔ سَدا سُکھ نے ان کو کھانا بنا کر کھلا دیا خود ایک لُقمہ بھی نہ کھایا، اور چارپائی پر لیٹ گئے۔ مگر آدھی رات تک نیند نہ آئی، سوئے تو جھٹ پٹ کسی نے جگا دیا۔ معلوم ہُوا نمبردار کے مکان کو ڈاکو لُوٹ رہے ہیں۔ سَدا سُکھ لاٹھی لے کر موقعہ پر پہنچ گئے، دس ڈاکو تھے گھر کے لوگ اُن کے سامنے دم بخود کھڑے تھے، سمجھتے تھے ہم بولے اور انہوں نے

گردن اُتار لی۔ اِس طرح کانپتے تھے جس طرح دہانِ توپ کے رُوبرو کھڑے ہوں۔ موت اُنہیں اتنی قریب کبھی نہ دکھائی دی تھی۔ لیکن سَنداُسکھ کے چہرے پر ذرا خوف نہ تھا۔ آتے ہی للکار کر بولے "اگر خیریت چاہتے ہو تو چُپ چاپ چلے جاؤ، ورنہ ایک ایک سے سمجھ لونگا، کمزور سمجھ کر چلے آئے ہو، مگر جب تک یہ بُڈھا جیتا ہے تمہاری کیا مجال ہے جو اِس گاؤں کے کسی آدمی کا بال بھی بیکا ہو جائے"۔

ڈاکو دنگ رہ گئے۔ سوچنے لگے یہ کون ہے جو پرائی آگ میں کُودتا ہے، ضرور کوئی خاص آدمی ہوگا، معمولی شخص میں ایسی جُرأت کہاں؟

ڈاکوؤں کے سردار نے آگے بڑھ کر پُوچھا "تم کون ہو"؟

سَنداُسکھ نے لاٹھی زمین پر ٹیک کر جواب دیا "میں سَنداُسکھ ہوں"۔

اِس نام نے ڈاکوؤں پر جادو کا کام کیا۔ سردار بولا "ہم آپ سے مقابلہ نہیں کر سکتے، آپ ہمیں مار بھی دیں جب بھی ہاتھ نہ اُٹھائیں گے گرفتار کرلیں جب بھی نہ بولیں"۔ پھر اپنے آدمیوں سے کہا "سب کچھ رکھ دو ایک پیسے کی چیز بھی نہ لو۔ یہ نیج ناتھ کے دیوتا ہیں، ان کا حکم ٹل نہیں سکتا"۔

(۶)

دُوسرے دن سارے گاؤں کے لوگوں نے آکر اپنی غلطی کی معافی

مانگی۔ نمبردار نے کہا "ہم آپ سے عہد لینے آئے ہیں کہ آپ اِس گاؤں سے کبھی نہ جائیں گے" ایک دو اور آدمی بولے "چلے کیونکر جائیں گے ہم رستہ روک لیں گے، سڑک پر لیٹ جائیں گے، آخر محبّت بھی کوئی چیز ہے۔ اُسے پاؤں میں مسل کر کیسے جائیں گے" ایک اور آدمی نے کہا "جب تک ہیرے کو کنکر سمجھتے تھے تب تک پروا نہ تھی، اب آنکھیں کھل گئی ہیں، اب اُسے کیونکر چھوڑ دیں" سَدا سُکھ کا دل محبّت کا سرچشمہ تھا۔ یہ باتیں سُن کر آبدیدہ ہو گئے اور بھرائی ہوئی آواز میں بولے "بھائیو! تم مجھے ناحق شرمندہ کرتے ہو، میں بھی تمہارے ہی جیسا معمولی آدمی ہوں۔ مجھ میں غیر معمولی بات کوئی بھی نہیں، ہاں خدمت کا عہد کیا ہے اُسے پورا کروں گا۔ اور کہیں نہیں۔ یہیں سہی۔ یہاں بھی وہی بھگوان ہے، یہاں بھی اُسی کی جوت جلتی ہے یہاں بھی اُسی کا اُجالا، اُسی کا جلوہ ہے۔ کہیں اور جا کر کیا لوں گا"۔

اب سَدا سُکھ پھر وہی سَدا سُکھ تھے جنہیں بیج ناتھ کے لوگ سر آنکھوں پر بٹھاتے تھے۔ اُن کے دل میں سَدا سُکھ کا وہی وقار تھا، وہی قدر و منزلت جو چھ سال پیشتر تھی، نفرت عارضی بیماری کی طرح رفع ہو گئی، کہتے اُس میں سَدا سُکھ کا کیا دوس تھا، اُن کے پاس کوئی چلا آئے یہ اُس کی خدمت کریں گے، بُرا یا بھلا اس سے انہیں کیا، یہ اس سے

غرض ہی نہیں رکھتے، بے کس دیکھا اپنے پاس رکھ لیا، اُس کا آدمی آیا ہنس کر ساتھ بھیج دیا۔ آدمی کاہے کو ہے کنول کا پھول ہے، جو پانی میں رہتا ہے مگر بھیگتا نہیں ہے"۔

لیکن سُندا سُکھ خوش نہ تھے، نہ اُن کے قلب کو پہلا سا اطمینان میسّر تھا، عموماً کھوئے سے رہتے۔ اب باہر چلے جاتے ہیں تو کوئی اُن کا انتظار نہیں کرتا، رات کو گھر سے نکلتے ہیں تو کوئی روکتا نہیں ہے، نہ پاس بیٹھ کر کوئی توتلی باتیں کرتا ہے، نہ کوئی لڑتا جھگڑتا ہے، نہ شکایتیں کرتا ہے۔ سُندا سُکھ کا جی کیونکر لگتا، جھونپڑا اُنہیں کاٹنے کو دوڑتا تھا، کبھی یہ جگہ اُن کے لئے پاکیزہ محبّت کا گہوارہ تھی، اُسوقت اِس میں اتنی کشش تھی، کتنی دل آویزی، کتنی یگانگت، اب کچھ بھی نہ تھا۔ پہلے جھونپڑا گھر بنا تھا، اب گھر سرائے بن گیا، دُنیا ہی تبدیل ہوگئی۔

اُدھر لکھنؤ سے چٹھیاں آتی تھیں۔ بھگوتی اُداس رہتی ہے، رامو بھی پہلے کی طرح نہیں چہکتا۔ ہاں آپ کی چٹھی آتی ہے تو دونوں کے چہرے کھِل جاتے ہیں۔ سُندا سُکھ لکھتے میں ذرا بھی اُداس نہیں ہوں نہ مجھے کوئی فکر ہے۔ بھگوتی لکھتی، آپ کو کھانے کی بہت تکلیف ہوگی، سُندا سُکھ جواب دیتے ایسا مزہ آتا ہے کہ تم سے کیا کہوں، شاید تم باور نہ کروگی،

میری بھوک بڑھ گئی ہے - بھگوتی پوچھتی، آپ کی صحت کیسی ہے ؟
سَدا سُکھ جواب دیتے، بہت عمدہ، پہلے تمہارے غم میں گھُلا جاتا تھا،
جب سے بھگوان نے تمہاری سُنی ہے مَیں موٹا ہونے لگا ہوں وغیرہ
وغیرہ کچھ دنوں باپ بیٹی کی یہ خط و کتابت جاری رہی، اس کے بعد
یکایک بند ہو گئی، سَدا سُکھ نے چٹھیاں لکھیں مگر کسی کا بھی جواب نہ ملا۔
یہاں تک کہ رجسٹری خط بھی بھیجے اُن کا بھی وہی حشر ہُوا۔ گویا لکھنؤ میں
اُن کا کوئی ہے ہی نہیں۔ سَدا سُکھ پہلے جھنجھلائے، پھر پریشان ہوئے
اور آخر میں بے پرواہ ہو گئے۔ سوچتے تھے مَیں بھی کیسا بیوقوف ہوں،
گھر سے خدمت کرنے چلا تھا، یہاں محبّت کے جال میں پھنس گیا۔ جیسے
انجان لڑکا سکول جاتے وقت کوئی تماشہ دیکھ کر رُک جائے، وُہ خط
نہیں لکھتے نہ سہی، مجھ سے اُن کا واسطہ ہی کیا؟

اب پھر وہی لیل و نہار تھے، وہی جھونپڑا تھا وہی یاتری تھے،
وہی سَدا سُکھ تھے، وہی اُن کا خدمتِ خلق کا عہد تھا، وہی بے فکری
کی نیند تھی۔ اِسی طرح ایک سال گزر گیا، پھر سردی کے دن آ گئے۔
پہاڑوں کی رونق کم ہونے لگی۔ اِن دنوں سَدا سُکھ کے جھونپڑے
میں مُسافروں کی تعداد کم ہوتی تھی، کسی کسی دن کوئی بھی نہ ہوتا تھا،
سَدا سُکھ دن بھر لیٹے رامائن اور گیتا کا مطالعہ کیا کرتے تھے یا آنکھیں بند

کئے کچھ سوچا کرتے تھے۔ شام کے وقت بیج ناتھ کے خوش عقیدت لوگ اُن کے پاس چلے آتے، اور آگ کے ارد گرد بیٹھ کر معرفت کی باتیں سُنتے تھے۔ گیان دھیان کی یہ رُوحانی محفل، پریم اور بھگتی کی یہ امرت برکھا کئی کئی گھنٹے جاری رہتی تھی، اور لوگ اپنی خوش بختی پر پھولے نہ سماتے تھے۔ کہ ایک دن سدا سکھ نے کہا، ہم کل لکھنؤ جائیں گے لوگ گھبرا گئے، کچھ لوگ ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ اُن کا خیال تھا شاید یہ پھر نہ آئیں۔ مگر سدا سکھ نے کہا، ہم ایک ہفتہ کے اندر اندر لوٹ آئیں گے "

(۷)

تیسرے دن دوپہر کے وقت وہ لکھنؤ میں تھے۔ اِس وقت اُن کے دل میں کیسی اُمنگیں تھیں، کیسی آرزوئیں، آج وہ اپنی مُنہ بولی بیٹی سے ملیں گے۔ آج اُن کا راموُ اُن کے گلے سے لپٹے گا، پُورا ایک سال گزر گیا، دیکھ کر چونک اُٹھے گا۔ ممکن ہے یکایک پہچان بھی نہ سکے۔ مگر جو خوشی بھگوتی کو ہو گی اُس کا اندازہ کون کر سکتا ہے۔ کیلاش ناتھ سے سیدھے مُنہ بات بھی نہ کروں گا۔ ایسا خود پرست، ایسا بے پروا آدمی بھی کس کام کا جو خط کا جواب تک نہ دے۔ یکایک امین آباد بازار میں اُنہوں نے ایک جگہ لڑکوں کا ہجوم دیکھا جو کسی شخص کو

گھیرے کھڑے تھے اور اُسے تنگ کر رہے تھے۔ دُوسرے لمحہ میں معلوم ہُوا درمیان میں کوئی پگلی عورت ہے اور آس پاس لڑکے ہیں۔ لڑکے چھیڑتے ہیں پگلی گالیاں دیتی ہے۔ سدا سُکھ نے اس کی طرف غور سے دیکھا اور چونک پڑے۔ جیسے پاؤں تلے انگارہ آ گیا ہو، جیسے کسی نے سُوئی چبھو دی ہو۔ یہ شہدوں میں گھری ہوئی پھٹے پُرانے کپڑوں والی، رُوکھے سُوکھے بالوں والی، تباہ حال عورت بھگوتی تھی۔ جیسے تن بدن کا کچھ ہوش نہ تھا۔ نہ موقع نہ محل کا علم تھا۔ ہائے نصیب! کیا دیکھنے آئے تھے کیا دیکھنا پڑا، سدا سُکھ کا سر چکرانے لگا۔ اُنہیں ایسا معلوم ہُوا جیسے امین آباد کی تمام دُکانیں ہوا میں تیر رہی ہیں، جیسے زمین آسمان سب گھوم رہے ہیں۔ اُنہوں نے اِکّہ سے اُتر کر اِکّے والے کو کرایہ دیا اور بھگوتی کی طرف بڑھے۔ اِس وقت اُن کا دِل ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا تھا، اُن کے پاؤں لڑکھڑا رہے تھے۔ یہ چار قدم کا فاصلہ کوسوں کی منزل بن گیا۔ اُنہوں نے ڈانٹ ڈپٹ کر لڑکوں کو پرے ہٹایا اور خود بھگوتی کے سامنے جا کر کھڑے ہو گئے۔ بھگوتی نے اُن کو پاگلوں کے مخصوص انداز سے گھور کر دیکھا اور اس کے بعد قہقہہ لگا کر ہنس پڑی ٭

سدا سُکھ نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا "بھگوتی!"

بھگوتی نے بغیر کسی جذبہ کا اظہار کئے سَدا سُکھ کی طرف دیکھا اور بولی "تو بھی اِن لونڈوں کے ساتھ ہے"۔

سَدا سُکھ :- نہیں، بھگوتی! میں بیج ناتھ سے آیا ہوں، تو مجھے پہچانتی ہے یا نہیں"؟

بھگوتی چُپ چاپ سَدا سُکھ کی طرف دیکھتی رہی، اس کے بعد یکایک بڑے زور سے چلّا کر بولی "یہ بُڈھا پاگل ہے"۔

لڑکے ہنسنے لگے۔ ایک بولا "لو باباجی اور کرو ہمدردی"۔

دُوسرا بولا "پگلی ہے"۔

بھگوتی نے چمک کر کہا "مجھے پگلی کون کہتا ہے، زبان کاٹ لُونگی"۔

یہ کہہ کر وہ زمین پر بڑے زور زور سے پاؤں مارتی ہوئی ایک کونے کی طرف چلی گئی اور وہاں گھُٹنوں پر سر رکھ کر بیٹھ گئی، اس کے بعد وہیں لیٹ کر کچھ گنگنانے لگی۔

اور لڑکے اُس کی طرف دیکھتے تھے اور چلّاتے تھے "پگلی پگلی"۔

یہ دلخراش منظر دیکھ کر سَدا سُکھ کا دل بھر آیا۔ آنکھوں سے آنسو چھلکنے لگے۔ ایک دُکاندار کے پاس جا کر بولے "یہ عورت اس حال میں کب سے ہے؟"

دُکاندار نے سَدا سُکھ کو سر سے پاؤں تک دیکھا اور کہا "بہت

دنوں سے، آپ پردیسی معلوم ہوتے ہیں؟"

سدا سکھ:- "جی ہاں (تھوڑی دیر کے بعد) تو کیا بابو کیلاش ناتھ نے اسے گھر سے نکال دیا؟"

دکاندار:- "آپ تو سب کچھ جانتے ہیں"

سدا سکھ:- "جی نہیں، بہت کم جانتا ہوں"

دکاندار۔ صاحب کیا عرض کروں، اِس غریب کی خستہ حالی کو دیکھ کر رونا آتا ہے۔ بھلے گھر کی بیٹی ہے، پہلے ماں نے خودکشی کی تھی، اب خود پاگل ہو گئی ہے۔ ایک لڑکا تھا، مگر جناب لڑکا کیا تھا گلاب کا پھول تھا، وہ بھی مر گیا"

سدا سکھ پر جیسے بجلی سی گر پڑی، کئی منٹ تک بے حس و حرکت کھڑے رہے۔ اس کے بعد آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ دکاندار نے پوچھا "آپ سے کچھ رشتہ ہے کیا؟"

سدا سکھ (آہ سرد بھر کر) "رشتہ ہی سمجھئے، میری منہ بولی بیٹی ہے"

دکاندار نے چونک کر سدا سکھ کی طرف دیکھا، اور بولا "تو آپ زیج ناتھ سے تو نہیں آرہے ہیں؟"

سدا سکھ:- "وہیں سے آرہا ہوں"

دکاندار:- "معاف فرمائیے گا کیسی حماقت ہوئی جو آپ کو بیٹھنے کو کرسی

بھی نہ دی۔ آئیے، آرام سے تشریف رکھیئے، یہ آپ کی اپنی دُکان ہے"۔

سدا سُکھ چُپ چاپ کرُسی پر جا بیٹھے۔

دُکاندار:- "کیلاش ناتھ سے آپ کی بہت تعریف سُنی تھی، کہتے تھے ایسا آدمی مَیں نے دُوسرا نہیں دیکھا"۔

سدا سُکھ (سُنا اَن سُنا کر کے) "جائے حیرت ہے کہ مجھے علم بھی نہ ہوا، اور یہاں تک نوبت پہنچ گئی"۔

دُکاندار:- "سب برادری کیلاش ناتھ کی مخالف تھی، ایک مَیں اور ایک اور صاحب دو آدمی تھے جو کیلاش ناتھ کے ساتھ تھے باقی سب خلاف تھے۔ یہاں تک کہ اُن کے چچا صاحب بھی صف مخالف میں تھے۔ کیلاش ناتھ چار مہینے ڈٹے رہے اس کے بعد اُن میں دم نہ رہا"۔

سدا سُکھ:- "میں نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ تُم پست حوصلہ ہو۔ تُم برادری کا مقابلہ نہ کر سکو گے۔ اُس وقت کہتے تھے برادری میرا کیا بگاڑ لے گی اور سچ بھی ہے اُن کا کیا بگڑا۔ زندگی لڑکی کی خراب ہوئی (بھگوتی کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے ہوئے) یہ حالت کب سے ہے"؟

دُکاندار:- "کوئی چھ مہینے سے، پہلے جانے کہاں چلی گئی تھی، یکایک

ایک دن بازار میں آگئی اور اس حال میں کہ تن بدن کی سُدھ نہ تھی تب سے یہی حال ہے"۔

سُدرشن سنگھ - اور کیلاش ناتھ تو خوب مزے میں ہونگے کیوں ؟ اسے اس حال میں دیکھ کر اُن کو شرم تو نہ آتی ہو گی"۔

دُکاندار۔" اب کیا عرض کروں، پہلے تو کہتے تھے، یہ عورت نہیں دیوی ہے ایسا ایثار، ایسی عقیدت، ایسی محبّت میں نے کسی میں کم دیکھی ہے۔ لیکن اب اُن کی رائے تبدیل ہو گئی ہے۔ کہتے ہیں آوارہ مزاج ہے کنوار پنے ہی میں تاک جھانک کی عادت تھی، ورنہ اپنے ساتھ دُوسروں کو بھی برباد نہ کرتی۔ کوئی اس کا ذکر بھی کر دے تو بُرا مانتے ہیں۔ اپنی آنکھوں سے اس کا یہ حال زبوں دیکھتے ہیں، اور مُنہ پھیر کر چلے جاتے ہیں"۔

سُدرشن سنگھ نے زمین کی طرف دیکھتے دیکھتے یکایک سر اُوپر اُٹھایا اور ایک آہ سرد بھر کر بولے" انسان اتنا بھی گر سکتا ہے!"

دُکاندار۔" انسان! میں اُسے انسان نہیں سمجھتا، لڑکی کا ذرا بھی قصور نہیں۔ قصور سارا اسی شیطان کا ہے، اب چلا ہے شریف بننے۔ ایک دن بازار میں مل گیا تھا، مَیں نے وہ کھری کھری سُنائیں کہ ذرا سا مُنہ نکل آیا زبان بند ہو گئی"۔

سدا سکھ:- اگر ہمّت نہ تھی تو بیج ناتھ سے کاہے کو لایا تھا، غریب وہیں پڑی رہتی، وہاں اگر کوئی سُکھ نہ تھا تو کم از کم دُکھ بھی تو نہ تھا"۔

دُکاندار:- اجی جناب وہاں وہ سورگ میں تھی سورگ میں، آپ کا نام سُن کر اُس کا چہرہ شگفتہ ہو جاتا تھا، میں نے سُنا ہے وُہ آپ کو باپ سے بھی بڑھ کر چاہتی تھی"۔

سدا سکھ پھر رونے لگے۔

دُکاندار:- اور سچ تو یہ ہے جو آپ نے کیا اس سے زیادہ باپ بھی نہ کرتا۔ سارا گاؤں ایک طرف اور آپ تنہا ایک طرف، اور پھر ایک اجنبی لڑکی کے لئے یہ معمولی بات نہیں ہے۔ کیلاش ناتھ مخالفت کا مقابلہ چار ماہ بھی نہ کر سکا، آپ چھ سال ڈٹے رہے۔ وہ نفس کی پیاس تھی، یہ رُوح کی بے غرض محبّت تھی"۔

سدا سکھ:- آپ کے خیال میں کیا کرنا چاہئے، کیلاش ناتھ سے ملنے کا میرا ارادہ اب نہیں ہے، فائدہ خاک نہ ہوگا، اُلٹا طبیعت میں رنج پیدا ہو جائیگا، کہئے تو لڑکی کو ساتھ لے جاؤں، اور نہ ہوگا آنکھوں کے سامنے تو رہے گی"۔

دُکاندار:- مگر پگلی ہے"۔

سدا سکھ:- شاید علاج معالجہ سے دماغ صحیح حالت پر آجائے۔ بیماری

خوفناک ہے، لیکن لاعلاج نہیں "۔

دُکاندار:۔ تو ضرور لے جائیے، یہاں کون بیٹھا ہے جسے اِس کا درد ہو۔ وہاں آپ تو ہوں گے "۔

سَدا سُکھ:۔ ارے بھئی! یہاں تو لونڈے چنگے بھلے کا دماغ خراب کردیں۔ کبھی پتھر مارتے ہیں، کبھی مُنہ چڑھاتے ہیں، اور وہ غریب لہو کا گھُونٹ پی کر رہ جاتی ہے "۔

دُکاندار:۔ اِس میں کیا شک ہے "۔

سَدا سُکھ:۔ تو یہی فیصلہ رہا، آج شام کو لے جاؤنگا، کہیں چلی تو نہ جائے گی؟"

دُکاندار:۔ جانا کہاں ہے؟"

لیکن شام کے وقت بھگوتی وہاں نہ تھی، سَدا سُکھ نے سارا شہر چھان ڈالا۔ سب گلی کُوچوں بازاروں میں تلاش کیا، مگر بھگوتی کہیں بھی نہ تھی۔ آخر دُوسرے دن گومتی سے لاش برآمد ہوئی۔ سَدا سُکھ نے سر پیٹ لیا۔ اِس طرح پھُوٹ پھُوٹ کر روتے تھے گویا اُن کی سگی بیٹی مر گئی ہو۔ مگر کیلاش ناتھ کی آنکھوں میں پانی نہ تھا، اُس دن اُس کے ہاں دوستوں کی دعوت تھی۔ چار بجے کے قریب اُدھر شہید وفا بھگوتی کی لاش جل رہی تھی اِدھر کیلاش ناتھ اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھے مُسکرا کر چائے پی رہے تھے "۔

(۸)

لیکن پرماتما کے ہاں دیر ہوتی ہے، اندھیر نہیں ہوتا۔ اِس واقعہ کو ابھی دو ہی مہینے گزرے ہونگے کہ کیلاش ناتھ کی تقدیر کا پانسہ پلٹ گیا روپیہ، پیسہ، مکان، دوکانیں، کاروبار سب سٹہ کی نذر ہو گیا، کل سب کچھ تھا آج کچھ بھی نہ تھا۔ گردش روزگار کی ایسی پُر عبرت مثالیں دُنیا نے کم دیکھی ہونگی، وہ شان، وہ شکوہ، وہ زر و مال سب خواب و خیال ہو گیا کیلاش ناتھ کارکنانِ قضا و قدر کی یہ ستم رانیاں دیکھتے تھے اور آہ سرد بھر کر رہ جاتے تھے۔ وہی لکھنؤ تھا جہاں کبھی اینٹھ کر چلتے تھے! اب اُن میں اتنی بھی جرأت نہ تھی کہ بازار کے درمیان سے نکل جائیں۔ وہی لکھنؤ کے لوگ تھے، جو کبھی اُن کو سر آنکھوں پر بٹھاتے تھے، اب ایسے بدل گئے تھے جیسے اُن سے جان پہچان ہی نہ ہو۔ یہاں تک کہ اُن کے قریبی رشتہ دار بھی اُن کو دیکھ کر مُنہ پھیر لیتے تھے۔ ڈرتے تھے کہ کہیں کچھ سوال ہی نہ کر بیٹھیں۔ اقبال کا ساتھ سبھی دیتے ہیں، زوال میں کوئی پاس بھی نہیں پھٹکتا۔ کیلاش ناتھ ایک دن گومتی کے کنارے جا کر کئی گھنٹے روتے رہے سوچتے تھے اس وسیع دُنیا میں میرے لئے کوئی گوشۂ عافیت، کوئی مامن نہیں۔ بیگانوں کی اِس دُنیا میں اُن کا اپنا کوئی بھی نہ تھا، کہاں جائیں کس کے سامنے دستِ سوال دراز کریں، اِس وقت اُن کو بدنصیب بھگوتی کی

یاد آئی۔ اگر وہ آج زندہ ہوتی تو کیا وہ بھی اُن کو اس طرح تنہا چھوڑ دیتی کبھی نہیں، یہ اُس کے لئے ناممکن تھا، وہ ایسا نہیں کر سکتی تھی۔ یہ اُس کی فطرت کے خلاف تھا۔ وہ جب مری تھی کیلاش ناتھ کی آنکھ سے پانی کا ایک قطرہ نہ نکلا تھا، آج اُس کی یاد نے اُن کو خون کے آنسو رُلا دیئے آج اُن کو اپنی رُوح کی گہرائیوں میں اُس نقصان کا احساس ہُوا جسے دُنیا کے تمام خزانے بھی پُورا کرنے سے قاصر تھے۔

بدنصیبی کی اس تیرہ و تار رات میں گومتی کے کنارے بیٹھ کر روتے ہوئے کیلاش ناتھ کو یکایک ایسا معلوم ہُوا جیسے بہت دُور، بہت فاصلہ پر اُمید کا دِیا روشن ہے۔ یہ دِیا کس قدر رُوح پرور، کس قدر زندگی بخش تھا۔ اُن پر بیخودی کی حالت طاری ہوگئی، وہ اُٹھ کر کھڑے ہوگئے اور اُس روشنی کی طرف پروانہ وار لپک کر چلے۔

قریباً ایک ماہ بعد وہ بیج ناتھ میں ستّا سنگھ کی جھونپڑی کے سامنے کھڑے تھے۔ رات کا وقت تھا، جھونپڑی میں ایک کُپّی جل رہی تھی، اندر جا کر اُن کی تمام تکلیفوں، تمام اذیّتوں کا خاتمہ ہو جاتا، لیکن اُن میں اندر جانے کی ہمّت نہ تھی۔ مُسافر نے سینکڑوں کوس کا فاصلہ پیدل طے کیا اور ہمّت نہ ہاری۔ مگر اسوقت اُس میں چار قدم چلنے کی بھی طاقت نہ تھی جھونپڑی کا چراغ روشن تھا، مگر اُمید کا چراغ نہ جانے کہاں چھپ گیا، کس گوشۂ

تاریک ہیں؟ آنِ واحد میں جیسے اُن کی نیند کھُل گئی! اور امید کا خواب ختم ہوگیا، وہ روشنی، وہ نغمۂ شیریں وہ مناظرِ دلکش دیکھتے دیکھتے نہ معلوم کہاں چلے گئے؟ اب پھر وہی تاریکی تھی، وہی یاس کا عالم۔ کیلاش ناتھ سوچنے لگے۔ مَیں بھی کیسا کوتاہ بیں ہوں۔ جو بغیر سوچے سمجھے یہاں کا رُخ کیا، اتنا بھی نہ سوچا کہ سدا سُکھ کے سامنے یہ رُوئے سیاہ لے کر کیسے جا سکوں گا وہ ہزار نیک ہوں۔ لیکن مجھ کو دیکھ کر ضرور مُنہ پھیر لیں گے۔ سیدھے منہ بات بھی نہ کریں گے۔ عجب نہیں دھکّے دے کر نکال دیں، کہیں میرے مکان میں تیرے جیسے سنگدل آدمی کے لئے جگہ نہیں، جو کہتا بہت کچھ ہے کرتا کچھ بھی نہیں۔ ہائے افسوس! مَیں یہاں کاہے کو آگیا ؛

گھر سے دُور، آدھی رات کے ہولناک اندھیرے میں کیلاش ناتھ نے چاروں طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ مگر کوئی پناہ کی جگہ نظر نہ آئی۔ سوا سال پہلے بھی وہ یہاں آئے تھے، لیکن اس آنے میں اور اُس آنے میں زمین آسمان کا فرق تھا، اُس وقت یہاں اُن کی رُوح بستی تھی یہاں بھگوتی کو دیکھ کر اُن کی طبیعت کا کنول شگفتہ ہوگیا تھا۔ اُن کا دل رقص کرنے لگا تھا۔ کاش! وہ اُسے لے کر یہاں چلے آتے۔ اور دُنیا کی شورشوں سے دُور، برادری کے ہنگاموں سے باہر ایک جھونپڑا ڈال لیتے تب اُن کی پاکیزہ اور پُرمسرّت زندگی پر دیوتا بھی رشک کرتے۔ مگر اب . . . .

اُن کی سونے کی لنکا خاک ہو چکی تھی، اُن کو ہوش آیا، مگر کب؟ جب تیر کمان سے نکل چکا تھا، جب اُن کے بس کی کوئی بات نہ رہی تھی، کیلاش ناتھ کا دل بیٹھ گیا۔ اُن کے پاؤں کانپنے لگے، اُن کی طاقت جواب دینے لگی، اُن کو ایسا معلوم ہوا کہ اُن کا جسم زمین پر گرتا جا رہا ہے، وہ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے دروازے کی طرف بڑھے مگر دروازے تک پہنچنے بھی نہ پائے تھے کہ گر کر بیہوش ہو گئے۔

اور اُن کے چاروں طرف رات کی تاریکی تھی اور سناٹا تھا۔

دُوسرے دن جب اُن کو ہوش آیا تو اُن کے سامنے سدا سکھ بیٹھے تھے۔ کیلاش ناتھ نے اُن کی طرف دیکھا اور حیران رہ گئے۔ یہ آدمی کیسا پاک نفس، کیسا بے لاگ، کیسا ہمدرد دل ہے۔ کیلاش ناتھ نے دیکھا اُن کی آنکھوں میں ذرا بھی خفگی نہ تھی۔ چہرے پر ذرا بھی انتشار نہ تھا۔ سدا سکھ اُن کی طرف اِس طرح دیکھ رہے تھے جس طرح باپ اپنے بیٹے کی طرف دیکھتا ہے اور یہ وہ شخص تھا جس نے اُن کی مُنہ بولی بیٹی کو قتل کیا تھا۔ اُف! کتنا حوصلہ ہے، عفو کی کس قدر طاقت ہے۔ مگر شاید اُنہوں نے مجھے پہچانا ہی نہ ہو۔ ضرور یہی بات ہے، میری شکل وصورت اِس قدر مسخ ہو گئی ہے کہ میری ماں دیکھے تو وہ بھی نہ پہچان سکے۔ انہوں نے تو مجھے ایک ہی دفعہ دیکھا ہے کیونکر پہچان لیتے۔

کیلاش ناتھ نے آنکھیں بند کرلیں اور صورت حال پر غور کرنے لگے۔ ایک مدت بعد خوشی آئی تھی۔ ایک جھلک دکھا کر پھر غائب ہو گئی ×

سدا سکھ نے کیلاش ناتھ کے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا "کیوں! اب طبیعت کیسی ہے؟"

ارے! یہ تو وہی محبت کا لہجہ ہے، وہی میٹھے لفظ، وہی دل کو بس میں کر لینے والا اندازِ گفتگو، ذرا بھی ترشی نہیں۔ کیلاش ناتھ کو پہلے شبہ تھا اب یقین ہو گیا، ضرور نہیں پہچانا۔ ورنہ مجھ جیسے گنہگار کی قسمت میں یہ لفظ کہاں! کیلاش ناتھ تھوڑی دیر انہی خیالات میں پریشان رہے اس کے بعد تلملا کر اٹھ بیٹھے اور پاگلوں کے مانند بولے "آپ نے مجھے ابھی تک نہیں پہچانا........"

سدا سکھ نے انہیں شانوں سے پکڑ کر چارپائی پر لٹا دیا اور مسکرا کر کہا، "آرام سے لیٹے رہو۔ میری نگاہیں ایسی نہیں کہ ایکبارگی کسی کو دیکھ کر بھول جائیں" ×

کیلاش ناتھ کا کلیجہ دھک دھک کرنے لگا، بولے "میں کیلاش ناتھ ہوں" ×

سدا سکھ "میں نے دیکھتے ہی پہچان لیا تھا" ×

کیلاش ناتھ "دیکھتے ہی پہچان لیا تھا، اور پھر بھی آپ مجھے اٹھا کر

اندر لے آئے، میرا علاج کیا۔ میری خدمت کی، آپ نے مجھے باہر کیوں نہ پھینک دیا، پڑا پڑا مر جاتا"۔

سدا سُکھ:"بھگوان کا نام لو، زندگی بڑی نعمت ہے"۔

کیلاش ناتھ:"اب جی کر کیا کروں گا، جب دل میں کوئی اُمنگ نہیں تو زندگی کس کام کی؟ اب بھگوان موت دیدے، تو جی جاؤں یہ زندگی موت سے بھی بدتر ہے"۔

سدا سُکھ تھوڑی دیر کے لئے چُپ ہو گئے، اس کے بعد بولے:۔

"تم مایوس کیوں ہو رہے ہو؟"

جواب میں کیلاش ناتھ کے مُنہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلا، مگر آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ ایسے جیسے کسی چٹان سے سوتا پھوٹ بہے جیسے کوئی بھرا ہوا گھڑا اُنڈیل دے۔ اور اتنا ہی نہیں، رنج و غم کی شدت سے اُن کا سارا بدن پسینہ پسینہ ہو رہا تھا گویا رُواں رُواں رو رہا تھا، تھوڑی دیر بعد اُن کو نیند آ گئی۔ سدا سُکھ نے اطمینان کا سانس لیا، اُن کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔

ایک آدمی نے جو اُن کے پاس ہی بیٹھا تھا آہستہ سے پوچھا۔

"یہ کون ہے؟ بھگوتی کا شوہر تو نہیں، وہی معلوم ہوتا ہے"۔

سدا سُکھ:"تم نے خوب پہچانا۔ وہی ہے"۔

اُس آدمی نے حیرت سے سَدا سُکھ کی طرف دیکھا اور کہا، "آپ اس کی تیمار داری کر رہے ہیں، آپ کی جگہ میں ہوتا تو اسے جُوتے مار کر باہر نکال دیتا، ایسا بدمعاش"۔

سَدا سُکھ "یہ دیکھنا میرا کام نہیں، میرا فرض صرف خدمت کرنا ہے، جو میرے دروازے پر آگیا میں اُس کا خدمتگار ہوں، خواہ وہ کیسا ہی بُرا کیوں نہ ہو۔ ہاں میرے جھونپڑے میں اُسے گُناہ کی اجازت نہ ہوگی"۔

اُس آدمی کو ایسا معلوم ہُوا کہ وہ کسی دیوتا کے سامنے کھڑا ہے۔ وہ دیوتا اس پست خیال، ذلیل دُنیا سے بہت اُونچا، بہت بلند ہے۔ اُس کا معیار کیسا روشن، پاکیزہ، متحرک، زندگی بخش ہے، اُس کے سینے میں عقیدت کے جذبات لہریں مارنے لگے، آنکھیں آبگوں ہوگئیں +

سَدا سُکھ کا جھونپڑا نیج ناتھ میں آج بھی موجود ہے۔ اُس کے پاس ہی اُن کی سمادھ ہے۔ اُن کے ایک عقیدت شعار نے وہاں سدا برت کھلوا دیا ہے جہاں غریبوں کو مُفت کھانا ملتا ہے۔ لیکن جو بات سَدا سُکھ کے عہد میں تھی وہ اب کہاں، اُس وقت اِس جھونپڑے کی فضا ہی اور تھی +

باپ

(۱)

لالہ راجہ رام نے دفتر سے آتے ہی خشمگیں لہجہ میں اپنی بیوی سے کہا "شادی نے آج پھر چوری کی"۔

کوشلیا لڑکی کے لئے کرتا سی رہی تھی، خاوند کی آواز سُن کر اس نے سر اُٹھایا، اور حیرت سے بولی "بڑا پاجی لڑکا ہے، ہر روز مار کھاتا ہے مگر اس کی آنکھیں نہیں کھلتیں۔ آج کیا چرایا ہے"؟

راجہ رام "کل رات جیب میں سَو روپیہ رکھا تھا، آج دفتر جا کر دیکھا، تو روپیہ تھا چونی نہ تھی، بس جناب کے ہاتھ لگ گئی ہو گی، کہاں ہے ذرا بلاؤ تو پوچھوں"۔

کوشلیا کا کلیجہ دھڑکنے لگا، اُس نے سمجھ لیا کہ آج پھر لڑکے کی خیر نہیں زبردستی مسکرا کر بولی، "تم کپڑے تو بدل لو، دفتر سے تھک کر

آئے ہو، آتے ہی غصّہ کرو گے تو صحت خراب ہو جائے گی"۔

راجہ رام: "تمہاری باتیں میں خوب سمجھتا ہوں۔ تم چاہتی ہو میں اُسے کچھ نہ کہوں۔ مگر یہ کبھی نہ ہوگا، میں آج اُس کی ہڈیاں توڑے بغیر نہ رہونگا۔ بتاؤ وہ کہاں ہے؟"

کوشلیا: "کہیں کھیلنے گیا ہے، ابھی آجاتا ہے، جلدی کیا ہے، جب آئے مار لینا"۔

راجہ رام: "بس میں نے بات کی اور تمہیں زہر چڑھا"۔

کوشلیا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ بھرائی ہوئی آواز میں بولی "میں نے تمہیں کیا کہا ہے جو آتے ہی گرجنے لگے۔ تمہارا لڑکا ہے چاہے مارو چاہے کاٹو، میری کیا مجال کہ اُف بھی کر جاؤں"۔

راجہ رام: "اتنا نہیں سوچتیں کہ لڑکا ہاتھ سے نکل جائیگا۔ اُسے ٹیڑھی نگاہ سے بھی دیکھوں تو رونے لگتی ہے"۔

کوشلیا نے کوئی جواب نہیں دیا، سر جھکا کر زمین کی طرف دیکھنے لگی۔

راجہ رام: "تمہیں تو یہ وہم ہو گیا ہے کہ مجھے بچّوں سے پیار نہیں، تم ماں ہو مگر آخر میں بھی تو باپ ہوں"۔

آخری بات سُن کر کوشلیا کو پھر بولنے کی جُرأت ہوئی، غصّہ سے مُنہ پھلا کر بولی "باپ ہو، مگر باپ کی محبّت تو تم میں کبھی نہ دیکھی۔ عجیب

بچہ تمہاری شکل دیکھ کر سہم جاتا ہے، اور محبت کی نگاہ کو ترستا ہے، مارنا جانتے ہو، پیار کرنا نہیں جانتے"۔

راجہ رام کو ہنسی آ گئی۔

کوشلیا اور بھی تیز ہو کر بولی "کیا مجال جو کبھی اس کو پیار سے گود میں لیا ہو، یا ہنس کر دو باتیں ہی کی ہوں، ہاں مارنے کو ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ معلوم نہیں معصوم بچہ اپنے دل میں کیا کہتا ہوگا"۔

راجہ رام "یہی کہ یہ میرا باپ نہیں ہے"۔

کوشلیا "چلو (ذرا ٹھہر کر) اگر میں کل مر جاؤں تو ان بچوں کا کیا ہوگا؟ رو رو کر جان دیدیں گے، مگر تم سے امید نہیں کہ تم انہیں چپ بھی کرا لو گے"۔

راجہ رام "تو اب تم مرنے پر بھی آمادہ ہو گئیں؟"

کوشلیا "کیسے آدمی ہو، ہر وقت تنے ہی رہتے ہو"۔

راجہ رام "یہ تمہارا غصہ اب اترے گا بھی یا نہیں؟"

کوشلیا "پرماتما نے بچے دیدیئے، پر عقل نہ دی کہ بچے شرارتیں بھی کیا کرتے ہیں، اب اس عمر میں تمہاری سی سمجھ کہاں سے لے آئیں"۔

راجہ رام "اگر حکم ہو تو آج سے مارنا چھوڑ دوں؟"

کوشلیا:- کیوں چھوڑ دو؟ میں یہ کبھی نہ کہوں گی۔ باپ کی طرح مارو، مگر باپ کی طرح پیار بھی تو کرو"۔

راجہ رام:- اور جسے پیار کرنا نہ آئے وہ کیا کرے؟ میرے خیال میں مار پیٹ میں کر دیتا ہوں، پیار تم کر لیا کرو، اب میں ہی سارے کام کیسے کر لوں؟"

کوشلیا:- بس یہی تو تم میں عیب ہے، ہر ایک بات کو ہنسی میں اُڑا دیتے ہو"۔

راجہ رام:- تو ہنسنا بھی جرم ہو گیا؟"

کوشلیا:- ہم سارا دن انتظار کرتے رہتے ہیں، اور تم آتے ہی کوئی نہ کوئی ایسی بات کر دیتے ہو کہ تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے"۔

راجہ رام" (ہنس کر) چلو آج شادی کو کچھ نہ کہیں گے، اور کیا کہتی ہو"۔

کوشلیا کو بھی ہنسی آ گئی، محبت آمیز نگاہوں سے راجہ رام کی طرف دیکھ کر بولی، "اپنے کمرے میں چل کر کپڑے بدلو، اتنے میں میں دودھ گرم کر لاؤں"۔

شادی کے سر سے آفت ٹل گئی۔

(۲)

لالہ راجہ رام سیدھے سادے آدمی تھے، گھر کا سیاہ و سفید

سب کوشلیا کے ہاتھ میں تھا۔ وہ جو چاہتی تھی کرتی تھی، راجہ رام اُس میں کبھی دخل نہ دیتے تھے۔ اُن کو یہ بھی علم نہ تھا کہ گھر میں کیا ہے کیا نہیں، اُن کو دو روٹیاں کھانے سے غرض تھی۔ وہ کماتے تھے کوشلیا خرچ کرتی تھی۔ اِسی طرح اُن کی متاہل زندگی کے سات آٹھ سال گزر گئے۔ کوشلیا کو اُن سے کوئی شکایت نہ تھی۔ سکھی سہیلیوں میں بیٹھتی تو اُن کی تعریف کے پُل باندھ دیتی۔ کہتی پرماتما ایسا خاوند سب کو دے اُن میں کوئی عیب نہیں، یہاں تک کہ حقہ بھی نہیں پیتے ذرا بلند آواز سے بولوں تو دب جاتے ہیں۔ لیکن ایک کانٹا تھا جو اُس کے دل میں ہمیشہ کھٹکتا رہتا تھا۔ اُن کو بچّوں سے محبّت نہیں تھی، وہ کبھی اُن کو گود میں لے کر پیار نہ کرتے تھے، کبھی بازار نہ لے جاتے تھے معمولی معمولی باتوں پر بھی دھمکاتے اور زور زور سے بولنے لگتے، جیسے کسی سے لڑ رہے ہوں۔ کوئی ملنے جُلنے والا اپنے بچّے کو ساتھ لے آتا، جب بھی اس کی پرواہ نہ کرتے، کوشلیا کہتی، تمہاری اتنی عمر ہوگئی پر تمہیں یہ عقل آج تک نہ آئی کہ کوئی گھر میں آئے تو اُس کے بچّے کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیر دینا اُس کی سب سے بڑی تواضع ہے وہ تمہارے پاس بیٹھے رہتے ہیں تم اُن کی بات بھی نہیں پوچھتے۔ سوچتے ہونگے بڑا مغرور ہے، معلوم نہیں دفتر کا کام کیسے کر لیتے ہو،

وہاں بھی غلطیاں کرتے ہو گے۔ راجہ رام یہ باتیں سُنتے تو قہقہہ لگا کر ہنس پڑتے۔ کوشلیا کو بھی ہنسی آ جاتی مگر اُس کے دل کی فکر دُور نہ ہوتی۔

اتوار کا دن تھا، لالہ راجہ رام دھوپ میں لیٹے ایک اخبار دیکھ رہے تھے۔ اتنے میں کوشلیا لڑکی کو لئے ہوئے آ کر اُن کی بغل میں بیٹھ گئی۔ اور اخبار چھین کر بولی "لو سُنو! تمہاری بیٹی نے آج ایک نئی بات سیکھی ہے"۔

راجہ رام "معلوم ہوتا ہے۔ اخبار نہ دیکھنے دو گی، بڑا دلچسپ مضمون تھا"۔

کوشلیا "اس کی بات اس سے بھی دلچسپ ہے"۔

راجہ رام "بھائی کو بُلانا سیکھا ہو گا"۔

کوشلیا "واہ! میری بیٹی کیا ایسی معمولی باتیں سیکھتی ہے، تمہارا دل خوش کر دے گی"۔

یہ کہہ کر کوشلیا نے شکنتلا سے کہا "کیوں بیٹی شنتی! تو مرے گی یا نہیں"؟

شنتی نے ماں کی طرف دیکھ کر زور سے سر ہلا کر کہا "ہاں"۔

راجہ رام کو ہنسی آ گئی۔

کوشلیا۔ "تو مرنا جانتی ہے"؟

شنّی نے پھر اُسی طرح بڑے زور سے سر ہلایا اور طفلانہ انداز سے کہا "ہاں"۔

کوشلیا۔ "کیسے مرے گی؟ بابو جی کو مر کر دکھا دے"۔

شنّی اپنا ناٹک دکھانے کے لئے جھٹ گود سے اُتر آئی۔ اس کے بعد اس نے ماں کے سر سے دوپٹہ اُتار کر اوڑھ لیا اور زمین پر چت لیٹ گئی۔

راجہ رام ہنستے ہنستے لوٹے جاتے تھے۔

کوشلیا (آہستہ سے) ذرا دیکھتے جاؤ (بلند آواز سے) شنّی! اری او شنّی!! باپ رے باپ کیسی لڑکی ہے۔ پتہ نہیں۔ کہاں چلی گئی (یکایک چونک کر) ارے۔ یہ تو یہاں لیٹی ہوئی ہے۔

شنّی نے اسی طرح لیٹے لیٹے مگر سر ہلا کر جواب دیا۔ چھنّی۔ نہیں۔ چھنّی۔ نہیں۔ ماں! چھنّی نہیں!

کوشلیا۔ (بلند آواز سے) "تو کیا شنّی مر گئی؟"

شنّی۔ (سر مار کر) ہاں (آخری لفظ کو لمبا کر کے) چھنّی مل دئی۔

راجہ رام نے ہنس کر بیٹی کو زمین سے اُٹھا لیا اور مُنہ چُوم کر کہا۔ "کیوں بیٹا! مرنے کی کیا ضرورت ہے، تیری ماں کو بڑا صدمہ ہوگا ابھی نہ مرنا"۔

ششّی نے دونوں ہاتھوں سے باپ کا مُنہ پکڑ لیا اور اُن کی آنکھوں میں اپنا عکس دیکھ کر کہنے لگی۔ "وودوہ چھنّی۔ وودوہ چھنّی!"

کوشلیا نے خاوند کو بیٹی سے پیار کرتے دیکھا تو اس کے قلب پر ایک کیف کا عالم طاری ہو گیا۔ وہ کسی دُوسری دُنیا میں پہنچ گئی۔ اتنی مسرّت اسے دو ہزار کا زیور لے کر بھی حاصل نہ ہوتی، وہ یہی چاہتی تھی اُس کی سب سے بڑی آرزو یہی تھی، وہ خاوند کا پیار مانگتی تھی۔ مگر اپنے لئے نہیں، اپنی اولاد کے لئے۔ کیسا پاکیزہ، کیسا سرور بخش۔ کیسا انبساط انگیز منظر تھا! باپ بیٹی سے پیار کرتا تھا اور ماں سامنے کھڑی دیکھتی تھی اور خوش ہوتی تھی +

یکایک کوشلیا کو شادی کا خیال آیا، گھر میں مٹھائی بَٹ رہی ہو تو ماں کو سارے بچّوں کا خیال آتا ہے۔ وہ نہیں برداشت کر سکتی کہ ایک بچّہ ساری مٹھائی اُڑا لے دُوسرا بالکل محروم رہ جائے۔ آج اس کے یہاں باپ کی محبّت بَٹ رہی تھی۔ پتہ نہیں کتنے دنوں بعد۔ بہن اپنا حصّہ لے چکی تھی، اب بھائی کی باری تھی +

کوشلیا نے دوپٹہ اوڑھ کر ششّی کو گود میں لیا اور جلدی سے نیچے اُتر گئی۔ وہاں شادی کاغذ سے کنکوّا بنا رہا تھا کوشلیا نے اُس کا مُنہ دھویا۔ نئے کپڑے پہنائے۔ سر میں تیل ڈالا۔ کنگھی کی اور آہستہ سے کہا۔

"جا! جا کر بابوجی کو کپڑے دکھا آ"۔

شادی نئے کپڑے پہن کر دل میں پھولا نہ سماتا تھا، مگر باپ کے پاس جانے کی بات سن کر اُس کا چہرہ اُتر گیا وہ آہستہ آہستہ سیڑھیوں پر چڑھنے لگا۔ اس کا دل اِس طرح دھڑک رہا تھا جیسے طالبِ علم امتحان دینے جا رہا ہو، مگر کامیاب ہونے کی کوئی اُمید نہ ہو۔

شادی آہستہ آہستہ باپ کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ لالہ راجہ رام اس وقت پھر اخبار دیکھ رہے تھے اُن کو معلوم بھی نہ ہُوا کہ لڑکا آ کر کھڑا ہے۔ شادی بہت دیر تک چپ چاپ انتظار کرتا رہا۔ اُس کے بعد جب اُس نے دیکھا کہ بابوجی تو میری طرف معلوم نہیں کب دیکھیں گے تو خطاوارانہ انداز سے ڈرتے ڈرتے بولا "بابوجی! نئے کپڑے!!"

لالہ راجہ رام نے چونک کر سر اُٹھایا اور پھر اخبار پڑھتے ہوئے بولے "کیا ہے شادی!"

شادی نے پہلے اپنے کپڑوں کی طرف دیکھا پھر بابوجی کی طرف اور تب آہستہ سے کہا "نئے کپڑے"۔

لالہ راجہ رام نے سر اُٹھائے بغیر مگر مسکرا کر جواب دیا "تم نے نئے کپڑے پہنے ہیں، بہت اچھا کیا، اب جاؤ جا کر کھیلو۔ میں اخبار پڑھ رہا ہوں"۔

شادی کی جان چھوٹی، لیکن کوشلیا کا اطمینان نہیں ہوا، وہ سیڑھیوں کے پاس کھڑی یہ سارا تماشہ دیکھ رہی تھی۔ شادی نیچے اُترنے لگا تو اُس نے اُسے پھر پکڑ لیا اور بغل میں لے کر آہستہ سے اُس کے کان میں کہا، "پیچھے سے جاکر بابو جی کی گردن میں باہیں ڈال دو"۔

شادی پھر اُداس ہو گیا۔ وہ سوچتا تھا، نئے کپڑے پہنے ہیں، چل کر اپنے ہمجولیوں میں رُعب جماؤں گا۔ لیکن ماں نے پھر اسی سرد مہر باپ کی طرف دھکیل دیا۔ جو اخبار پڑھتا تھا، پیار نہ کرتا تھا۔ اس پر جیسے کوئی بڑی بھاری مصیبت ٹوٹ پڑی۔ کمزور طالب علم دُوسری دفعہ پھر امتحان دینے چلا، اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ چہرے کا رنگ اُڑا جاتا تھا۔ حُسنِ اتّفاق سے ایک مرتبہ پاس ہو گیا تھا، کیا اب دُوسری مرتبہ بھی پاس ہو جائیگا؟ نہیں اسے اس کی ذرا بھی اُمید نہ تھی! لیکن مجبوراً پھر گیا اور باپ کی پیٹھ کی طرف جاکر کھڑا ہو گیا، مگر گردن میں باہیں ڈالنے کی جُرأت اُس میں نہ تھی۔ نہیں باپ خفا نہ ہو جائے۔ ایک مرتبہ ہنس کر ٹال دیا لیکن اب جان نہ بچے گی۔ اُس نے سیڑھیوں کی طرف دیکھا، اگر ماں نہ ہو تو بھاگ جاؤں، جان چھوٹ جائے، پھر دیکھا جائیگا مگر وہ وہیں کھڑی تھی اور اشاروں سے کہہ رہی تھی، "دیکھتا کیا ہے جلدی سے لپٹ جا"۔

اب شادی کے لئے کوئی اور چارہ کار نہ تھا، اُس نے جان پر کھیل کر اپنی ننھّی ننھّی باہیں کھولیں اور بڑے زور کے ساتھ باپ کی گردن سے لپٹ گیا ٭

راجہ رام اخبار کے دلچسپ مضمون میں محو تھے، اُن کے ہاتھ سے اخبار گر گیا۔ چونک کر بولے "ارے کون؟ شادی!" شادی نے اُن کی طرف مُسکرا کر دیکھا۔ لیکن یہ مُسکراہٹ آزادی کی مُسکراہٹ نہ تھی جس کے پیچھے قہقہہ چھپا رہتا ہے۔ یہ وہ مُسکراہٹ تھی جو خوف کے سایہ میں چلتی ہے اور قدم قدم پر لرزتی ہے۔ جیسے چاندنی رات میں بادل چھا جائیں، اُس وقت چاندنی کیسی پھیکی دکھائی دیتی ہے، کیسی بے نُور۔ یہی حال شادی کی مُسکراہٹ کا تھا ٭

راجہ رام نے شادی کی طرف ناراضگی سے دیکھا اور کڑک کر کہا۔ "جاؤ! جا کر کھیلو۔ نئے کپڑے پہنے ہیں تو کیا مجھے اخبار نہ پڑھنے دوگے؟"

شادی سہم کر چلا آیا اور آہستہ آہستہ نیچے اُتر گیا۔ جیسے کسی نے مُنہ پر تھپڑ مار دیا ہو۔ کوشلیا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ طالب علم کے فیل ہونے پر اُس کا اُستاد بھی رنجیدہ ہو جاتا ہے، اُس نے آہ سرد بھری اور اپنی کوٹھری میں جا کر چارپائی پر لیٹ گئی۔ اسوقت اس کی آنکھیں پُرنم تھیں اور دل میں ایک آگ سی لگی ہوئی تھی۔

رہ رہ کر سوچتی تھی، کیسے بے درد ہیں، انہیں بچّوں سے ذرا بھی پیار نہیں۔ اگر ہنس کر دو باتیں کر لیتے تو ان کا کیا نقصان ہو جاتا۔ اِس طرح دھتکار دیا! جیسے کوئی فقیر کا لڑکا بھیک مانگنے آیا ہو۔ اُنہیں اخبار کا خیال ہے بچّے کا خیال نہیں۔ اتنا بھی نہ سوچا کہ غریب کا دل چھوٹا ہو جائیگا۔

کوشلیا کی آنکھوں کے آنسو اس کے رُخساروں پر بہنے لگے۔

شکنتلا نے ماں کے چہرے پر اپنے ملائم ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "ماں!"

کوشلیا نے اُس کی طرف غمناک آنکھوں سے دیکھا اور اُس کا مُنہ چُوم کر بولی "کیوں بیٹی کیا ہے؟"

شکنتلا نے دل کو موہ لینے والے انداز میں جھُوم جھُوم کر کہا "چھنّی نہیں۔ چھنّی نہیں۔ ایں ایں"۔

کوشلیا کی آنکھیں بیٹے کی بدنصیبی پر اشکبار تھیں، لیکن اس کے ہونٹ بیٹی کی باتوں پر ہنس رہے تھے۔ جیسے بعض وقت برکھا میں دھوپ نکل آتی ہے۔

مگر راجہ رام اپنے اخبار کے دلچسپ مضمون کے مطالعہ میں مستغرق تھے اور کوشلیا کے دل میں رنج و راحت کے کیسے جذبات پیدا ہو رہے ہیں اس کا انہیں ذرا بھی علم نہ تھا۔

(۲)

اس کے چند دن بعد راجہ رام کے مکان پر ایک جلسہ ہُوا۔ اُن کے دفتر کے کلرکوں نے اُنہیں ایام میں ایک سوسائٹی HAPPY CLUB قائم کی تھی، اس کلب کے بیشتر ممبر گانے بجانے والے اور خوش باش آدمی تھے۔ ہر ہفتہ کی شب کو کسی نہ کسی ممبر کے مکان پر جمع ہوتے اور دو گھڑی دل بہلاتے۔ لالہ راجہ رام گانا بجانا قطعاً نہ جانتے تھے لیکن اُنہیں گانا سُننے کا بیحد شوق تھا HAPPY CLUB کے ممبر بن گئے۔ آج اُن کے یہاں اسی کلب کی میٹنگ تھی، اندر باہر دوڑتے پھرتے تھے جیسے اُن کے بیٹے کا بیاہ ہو۔ تاراچند گاتا تھا ہنس راج ہارمونیم بجاتا تھا اور لوگ ہمہ تن محو ہو کر سُنتے اور مستانہ وار جھومتے تھے۔ تاراچند کوئی ماہر فن نہ تھا نہ اُسے علم موسیقی کے اصول و قواعد سے واقفیت تھی لیکن اُس کی آواز ایسی شیریں و لوچدار تھی کہ سُن کر لُطف آجاتا تھا، لوگ کہتے تیری آواز میں جادُو ہے جبھی تو دل موہ لیتا ہے۔ گاتے گاتے جب اُس کی آواز نیچے اُترتی اور رفتہ رفتہ اِس قدر مدھم ہو جاتی کہ اُسے سُننا بھی دُشوار ہو جاتا تو ممبران عش عش کر اُٹھتے۔ مگر راجہ رام کا اِس طرف ذرا بھی خیال نہ تھا اُن کی تمام تر توجہ ممبروں کی خاطر تواضع میں لگی ہوئی تھی، سوچتے تھے کوئی کمی نہ رہ جائے۔ کل کوئی یہ نہ کہے

کہ راجہ رام کے یہاں کا انتظام ٹھیک نہ تھا۔کسی کو سگریٹ دیتے تھے کسی کو دیا سلائی کی ڈبیا۔کسی کو پان سپاری۔ اتنے میں ایک آدمی نے کہا "بابو تاراچند کا گلا بیٹھا جاتا ہے، انہیں الائچی اور مصری لادو ورنہ محفل سُونی ہو جائے گی"۔

تاراچند نے ہنس کر اُس بابو کی طرف دیکھا اور کہا "شکریہ"۔

لالہ راجہ رام بھاگے بھاگے اندر گئے اور بیوی سے بولے،

"الائچی اور مصری کہاں ہے؟"

کوشلیا نے سبزی کترنا بند کر دیا، اور اُٹھ کر الماری سے مصری اور الائچی کی پلیٹ نکال کر خاوند کو دیتے ہوئے بولی:۔

"یہ کون گا رہا ہے؟"

راجہ رام "بابو تاراچند ہے"۔

کوشلیا "خوب گاتے ہیں، آواز بڑی میٹھی ہے"۔

راجہ رام "کیا کہنے ہیں، سبھی مست ہو رہے ہیں"۔

یہ کہہ کر واپس مُڑنے کو تھے، کہ کوشلیا نے آہستہ سے کہا:۔

"ذرا ایک بات تو سُنتے جاؤ"۔

راجہ رام (ٹھہر کر) "کیا کہتی ہو جو کچھ کہنا ہو جلدی کہو، دیر ہو گئی تو لوگ طعنے ماریں گے، کہیں گے معلوم ہوتا ہے مصری گھر میں نہ تھی،

بازار سے لائے ہو؟"

کوشلیا:۔ "ارے تو کیا یہ لوگ ایسے شُہدے ہیں، دُوسروں کی عزّت کا خیال ہی نہیں کرتے"۔

راجہ رام:۔ "ایک دفتر میں کام کرنے سے بے تکلفی ہو ہی جاتی ہے"۔

کوشلیا:۔ "بچّوں کو بھی لے جاؤ، بار بار جا کر دروازے جھانکتے ہیں"۔

راجہ رام:۔ "جھانکنے دو، اندر جا کر کیا کریں گے، آواز باہر سے بھی سُنائی دیتی ہے اور بالکل صاف"۔

کوشلیا:۔ "ایک طرف بٹھا دینا، بیٹھے رہیں گے"۔

راجہ رام:۔ "اور جو کوئی شرارت کی تو پھر؟"

دونوں بچے سامنے کھڑے اپنی "قسمت کا فیصلہ" سُننے کے منتظر تھے۔

کوشلیا نے پُوچھا "اندر جا کر شرارت تو نہ کرو گے؟"

شادی (پُر امید لہجہ میں) "چُپ چاپ بیٹھے رہیں گے"۔

راجہ رام:۔ "تم چُپ چاپ بیٹھنا جانتے ہی نہیں، چُپ چاپ کیسے بیٹھو گے"؟

شادی نے سر جُھکا لیا اور ایک کونے میں مُنہ چُھپا کر رونے لگا۔ مگر شنّی اتنی جلدی ہمّت ہارنے والی نہ تھی۔ اُس نے باپ کی ٹانگوں سے

پلٹ کر کہا "چھنّی نہیں ہِن..... چھنّی نہیں ہِن ہِن ہِن....."
اور بیچاری ماں کا دوپٹہ پکڑ کر اُسے زور زور سے کھینچنے لگی، اور مُنہ بسورنے لگی۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ "انہیں کہو لے چلیں"۔
کوشلیا نے کہا "وہ نہیں شرارت کریں گے، لے جاؤ"۔
راجہ رام کا دل نہ مانتا تھا کہ یہ بچے وہاں خاموش بیٹھ سکیں گے، مگر بیوی کے سامنے بولتے ہوئے ڈرتے تھے کہ اگر اسے غصہ چڑھ گیا تو ابھی کڑکنے لگے گی، اس کی آواز باہر تک سُنائی دے گی، سارا مزہ کرکرا ہو جائیگا مجبور ہو کر بولے "اچھا۔ آجاؤ، مگر خبردار شور نہ مچانا"۔
شادی کے بہتے ہوئے آنسو رُک گئے۔ چہرے پر ہنسی آگئی، کرُتے سے آنکھیں صاف کرتا ہُوا بولا "نہیں کریں گے"۔
راجہ رام "شنّی کو اُٹھا لو اور چلے آؤ"۔
شادی بہن کو اُٹھا کر باہر لے گیا اور مردانہ کمرہ میں ایک طرف ہو کر جا بیٹھا، پاس ہی فنّی کو بھی بٹھا لیا۔ شنّی نے اپنی متحیر آنکھوں سے اتنے آدمی دیکھے تو ڈر گئی اور اُٹھ کر شادی کی گود میں جا بیٹھی۔
راجہ رام مصری اور الائچی تقسیم کرنے لگے۔ جب تک وہ دُور تھے تب تک شنّی خاموش رہی، مگر جب بالکل قریب آگئے تو اُس کا

صبر و قرار جاتا رہا، اُس کے لمبے لمبے سنہرے بال اُس کی آنکھوں پر پڑ رہے تھے۔ اُس نے ایک ہاتھ سے اُنہیں پرے ہٹایا اور دوسرا ہاتھ باپ کے سامنے پھیلا کر بے صبری سے کہا "میں!"

جو پاس بیٹھے تھے وہ ہنسنے لگے۔ راجہ رام نے مصری کی تین چار ڈلیاں اُس کے ہاتھ پر رکھ دیں اور کہا "یہ لو "میں" کی مصری ہے چُپ چاپ کھا لو، مگر شور نہ مچانا، نہیں مار پڑے گی"۔

شادی کے دل میں کچھ کچھ حسد ہونے لگا، اُس کی نگاہیں مصری پر تھیں۔ وہ اپنی زبان ہونٹوں پر پھیرتا تھا، اُسے اُمید تھی ابھی مجھے بھی ملتی ہے۔ مگر راجہ رام آگے بڑھ گئے اور اُسے مصری نہ ملی۔ شادی اُداس ہو گیا، اُس کا چہرہ اُتر گیا، سوچنے لگا سب کو ملی ہے مجھ کو نہیں ملی، یہ کیوں؟ اگر ماں ہوتی تو یہ بے انصافی کبھی نہ کرتی۔ جب بڑا ہونگا اور روپیہ کماؤں گا تو دس پندرہ روپے کی مصری لے آؤنگا اور پیٹ بھر کر کھاؤں گا، دوسروں کو بھی دونگا مگر بابوجی کو ایک ڈلی بھی نہ دونگا۔ مانگیں گے تو کہوں گا تم نے بھی تو مجھے نہیں دی تھی، اب شنّی سے مانگو۔

مگر بڑا ہونے کا، روپیہ کمانے کا اور پیٹ بھر کر مصری کھانے کا وقت ابھی بہت دُور تھا اور شنّی کی مصری بڑی تیزی سے ختم ہو رہی

تھی۔ شادی نے اُس کی آنکھ بچا کر ایک ڈلی اُٹھالی اور مُنہ میں رکھ لی۔ اگر شنّی نہ دیکھتی تو معمولی بات تھی، مگر اُس نے دیکھ لیا اور مچل گئی۔ شادی اُسے پیار سے مناتا تھا اور وہ غصّہ سے اس کا منہ نوچتی تھی کہ میری مصری تُو نے کیوں کھائی؟ اس کے بعد وہ زمین پر لیٹ گئی اور چیخ چیخ کر رونے لگی۔ گانے میں ذرا سا شور بھی ہو تو اس کا لُطف جاتا رہتا ہے۔ تاراچند نے گانا بند کر دیا اور کہا "یہ روتی کیوں ہے؟"

کئی آدمیوں نے شنّی کو چُپ کرانے کی کوشش کی مگر وُہ چُپ نہ ہوئی بلکہ اَور بلند آواز سے رونے لگی۔ جہاں گانا ہوتا تھا وہاں رونا مچ گیا۔ محفل میں بدمزگی پھیل گئی۔ لالہ راجہ رام کسی کام سے اندر گئے تھے واپس آئے تو یہ منظر دیکھا، لپک کر شنّی کے پاس پہنچے اور اُسے شہربار آنکھوں سے دیکھ کر بولے "کیوں۔ کیا ہُوا جو یُوں چلّا رہی ہے؟"

ایک آدمی نے کہا "بچّی ہے، نرمی سے بولو نہیں ڈر جائے گی"۔ شنّی سہم گئی، اُس کی آنکھوں کے آنسو آنکھوں ہی میں رُک گئے۔ ڈرتے ڈرتے بولی "چھادی!" جس کا مطلب یہ تھا کہ شادی نے میری مصری چھین لی ہے۔

راجہ رام کے تن بدن میں آگ لگ گئی، لیکن دُوسروں کے رُوبرو کیا کہتے، خُون کا گھُونٹ پی کر رہ گئے۔ اور آہستہ سے مگر سختی کے لہجہ میں بولے "دونوں باہر چلے جاؤ"۔

بچّے ہماری زبان سمجھیں یا نہ سمجھیں مگر آنکھیں پہچاننے میں کبھی غلطی نہیں کرتے۔ شنّی بھی سمجھ گئی کہ اگر اِس وقت ضد کروں گی تو پِٹ جاؤنگی۔ چُپ چاپ بھائی کی گود میں چلی گئی۔ شادی اُسے لے کر باہر نکل گیا مگر راجہ رام کا غُصّہ ابھی فرو نہ ہُوا تھا، انہوں نے صحن میں جا کر شادی کو کان سے پکڑ لیا اور غصّہ سے بولے "کیوں پاجی! تُو نے اِس سے مصری کیوں چھینی۔ لوگ کیا کہتے ہونگے، یہی کہ اس نے کبھی مصری کا مُنہ نہیں دیکھا"۔

شادی نے شنّی کو گود سے اُتار کر زمین پر کھڑا کر دیا اور مُجرم کی طرح سر جھُکا کر چُپ چاپ زمین کی طرف دیکھنے لگا۔ جیسے اُس کی قوّتِ گُفتار سلب ہوگئی ہو۔ راجہ رام اس کے سامنے غُصّہ سے دانت پِیس رہے تھے۔

شنّی نے مار پیٹ کے یہ آثار دیکھے تو روتی ہوئی بھاگ گئی اور باورچی خانہ میں جا کر ماں سے بولی "ماں! بابُو، چھادی۔ ماں! بابُو، چھادی"۔ یعنی بابوجی شادی کو مار رہے ہیں۔

کوشلیا نے جلدی سے باہر نکل کر دیکھا تو راجہ رام لڑکے کو بُری طرح مار رہے تھے۔ ایسی بے رحمی سے بچّے کو کوئی پرایا بھی نہ مارتا۔ ماں کا دل بیتاب ہو گیا، شادی پٹتا تھا اور دم نہ مارتا تھا، مبادا باپ کو اور غُصّہ چڑھ جائے، مگر ماں کو دیکھ کر اُس کی چیخیں نہ رُک سکیں۔ کسی ہمدرد کے سامنے ہم اپنے قابو میں نہیں رہتے۔ کوشلیا نے شادی کا ہاتھ پکڑ کر اُسے اپنی طرف کھینچ لیا اور کہا "کیا اب مار ہی ڈالو گے؟"

راجہ رام (ہانپتے ہوئے) "مَیں نے کتنی مرتبہ کہا تھا کہ انہیں باہر نہ بھیجو شرارت کریں گے، اُس وقت تم مانتی ہی نہ تھیں"۔

کوشلیا "تو کس کا خُون کر آیا ہے جو اُسے ہلاک کرنے پر تُل گئے ہو"۔ یہ کہہ کر کوشلیا اپنے دوپٹے کے آنچل سے شادی کے آنسو پونچھنے لگی۔

راجہ رام "کس کا خُون کیا ہے؟ سارے جلسے کا خُون کیا، ساری میٹنگ کا خُون کیا"۔

کوشلیا۔ (قدرے بلند آواز سے) "بہت اچھّا کیا خُوب کیا، یہ گھر ہے، ناٹک کا منڈپ نہیں، ایسے جلسے کرنے ہوں تو باہر جا کر کیا کرو۔ یہاں بچّے شور مچائیں گے کھیلیں گے، جو چاہیں گے کرینگے"۔

راجہ رام (طنزیہ پیرایہ میں) "ذرا اور بلند آواز سے بولو۔ ابھی آواز باہر نہ سُنائی دیتی ہو گی"۔

کوشلیا:۔ "ہزار بار سُنائی دے، مجھے کسی کی پروا نہیں"۔

راجہ رام:۔ "لوگوں کو تماشا دکھانے کا ارادہ ہے تمہارا! شرم تو نہ آتی ہو گی"۔

کوشلیا:۔ "کیا دُنیا بھر کی شرم میرے ہی لئے رہ گئی ہے۔ جب تمہیں نادان بچے کو اس طرح مارتے ہوئے شرم نہیں آتی تو مجھے اُسے بچاتے ہوئے کیوں شرم آئے؟"

راجہ رام (ذرا گرم ہو کر) "دیکھو! مَیں بے شرم ہوں، بے غیرت نہیں ہوں، مَیں سوچتا ہوں، جھگڑا نہ بڑھ جائے۔ تم سر پر سوار ہوئی جاتی ہو، مگر مَیں صاف کہے دیتا ہوں کہ مَیں تمہیں اس طرح اپنے رُوبرو بکواس نہ کرنے دُونگا"۔

کوشلیا:۔ "اور مَیں بھی تم سے صاف کہے دیتی ہوں کہ مَیں تمہیں اس طرح بچّوں کو مارنے کی کبھی اجازت نہ دونگی۔ اگر کوئی ہڈّی وڈّی ٹُوٹ گئی تو مصیبت میرے سر پر ٹُوٹے گی۔ تمہارا کیا ہے، تم تو دفتر چلے جاؤ گے"۔

راجہ رام نے بیوی کی طرف دیکھا تو ڈر گئے، مُنہ کی بات مُنہ ہی

میں رہ گئی۔ اس وقت کوشلیا کے چہرہ پر غصّہ تھا۔ آنکھوں میں آگ کے شرارے اُنہوں نے غصّے کی حالت میں بھی سمجھ لیا کہ اگر ایک لفظ بھی کہا تو بارود کے ڈھیر پر دیا سلائی کا کام دیگا۔ اُنہوں نے سر جُھکا لیا اور مردانے میں چلے گئے۔ وہاں سنّاٹا چھایا ہُوا تھا، راجہ رام کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا اُن کی لڑائی کی باتیں اُن کے دوستوں نے سُن لی تھیں۔ ندامت سے بولے "گانا کیوں بند کر دیا، گاؤ نا؟"

ہیپی کلب کے ممبروں نے ایک دُوسرے کی طرف پُرمعنی انداز سے دیکھا۔ گویا نگاہوں ہی نگاہوں میں مشورے ہونے لگے کہ یہاں تو میاں بیوی میں جھگڑا ہو گیا، اب ٹھہریں یا چلتے بنیں؛

راجہ رام سیدھے سادے آدمی تھے مگر بیوقوف نہ تھے، ان نگاہوں کے معنی سمجھنے میں اُنہیں ذرا بھی دیر نہ لگی شرم سے چہرہ سُرخ ہو گیا، تاہم سنبھل کر بولے "گائیے نا؟ آپ تو چُپ ہی ہو گئے"؛

تاراچند نے پھر گانا شروع کیا، ہنس راج کی اُنگلیاں پھر ہارمونیم کے سُروں پر دوڑنے لگیں۔ اِدھر یہ راگ و رنگ کا جلسہ ہو رہا تھا اُدھر گھر کے اندر شادی سسکیاں بھر بھر کر رو رہا تھا، اور کوشلیا اُسے گلے سے لگا کر چُپ کرانے کی کوشش کر رہی تھی، مگر اُس کے

آنسو نہ رُکتے تھے۔

(۴)

صُبح کو شادی بُخار میں بے ہوش پڑا تھا، اُسے تن بدن کی سُدھ نہ تھی راجہ رام نے دیکھا تو ڈر گئے اور اپنی حماقت پر پچتانے لگے کہ ناحق مارا، اب کوشلیا شیر ہو جائے گی، کہے گی اس وقت مارتے تھے اب سرہانے بیٹھ کر علاج کرو۔ کوشلیا کے سامنے اُن کی آنکھیں نہ اُٹھتی تھیں، نہ اُس سے بات چیت کرنے کی جُراَت تھی، اُن کو اندیشہ تھا کہ میں نے بات کی اور کوشلیا نے کڑکنا شروع کیا۔ کوشلیا کی کڑک اُن کے لئے بجلی کی کڑک سے بھی بھیانک تھی۔ بغیر کچھ کہے سُنے ڈاکٹر کو بُلا لائے اور اُس سے راہ میں ساری کہانی بیان کر دی ڈاکٹر نے آکر شادی کو دیکھا اور نسخہ لکھنے لگا۔

کوشلیا نے پردہ کی آڑ سے مدھم آواز میں شوہر سے کہا، "پوچھو کوئی ہڈی وڈی تو نہیں ٹوٹ گئی"۔

ڈاکٹر۔ "نہیں صرف ڈر گیا ہے"۔

کوشلیا۔ "بخار کب تک اُتر جائیگا؟"

ڈاکٹر۔ "ایک دو دن میں، گھبرانے کی بات نہیں ہے، نُسخہ دیتے ہوئے دن میں تین مرتبہ دوا دو ٹھیک ہو جائیگا"۔

مگر تین دن گزر گئے اور بخار نہ اُترا، کوشلیا کو کسی پہلو کل نہ پڑتی تھی۔ تمام رات جاگتی رہتی تھی، ایک طرف بیمار بچے کی تیمارداری کرنی پڑتی تھی، دوسری طرف شکنتلا کو سنبھالنا پڑتا تھا۔ چوتھی رات راجہ رام نے کہا "آج میں جاگوں گا، تم جا کر آرام کرو"۔

کوشلیا "تم کو جاگنے کی عادت نہیں، بیمار ہو جاؤ گے"۔

راجہ رام "نہیں ہونگا، تم جا کر سو رہو"۔

کوشلیا۔ (غصہ سے) "تمہیں خواہ مخواہ تکلیف ہوگی"۔

راجہ رام "قصور بھی تو میرا ہی ہے"۔

کوشلیا "صبح دفتر نہ جا سکو گے"۔

راجہ رام "چھٹی لے لونگا"۔

کوشلیا کا غصہ اُتر گیا، خاوند کی طرف محبت آمیز نگاہوں سے دیکھ کر بولی "میں تمہیں نہ جاگنے دونگی، جاؤ جا کر آرام کرو، ورنہ کل سارے دن طبیعت خراب رہے گی (ٹائم پیس کی طرف دیکھ کر) دس بج گئے ہیں کب تک بیٹھے رہو گے"۔

راجہ رام۔ معلوم ہوتا ہے تم نے بیمار ہونے کا فیصلہ کر لیا ہے۔

یہ کہہ کر سونے چلے گئے۔ کوشلیا نے شادی کی نبض پر ہاتھ رکھ کر دیکھا اور آہ سرد بھری۔ جسم ابھی تک گرم تھا، اُس کے دل میں

بُرے بُرے خیال آنے لگے، کہیں بچّے کو کچھ ہو نہ جائے۔ پرماتما غریب کو بخش دے۔ ہم نادار ہیں، ہمارے پاس دولت نہیں، ہمارا روپیہ پیسہ یہی بچّے ہیں، یہ سلامت رہیں، ہمیں کچھ نہ چاہیئے۔

گھڑی میں دس بج گئے، شادی نے کروٹ بدلی اور چلّا کر کہا، "ماں! پانی"۔

کوشلیا نے پیار سے شادی کے مُنہ پر ہاتھ پھیرا اور اُسے اپنی بانہہ کا سہارا دے کر بٹھا دیا "پہلے دوا پی لو، پھر پانی ملیگا"۔

شادی "نہ پہلے پانی دو۔ بڑی پیاس لگی ہے"۔

کوشلیا "دوا کب پیو گے۔ دس بجے دوا دینی ہے"۔

شادی۔ پہلے پانی دو۔ یہ کہتے کہتے شادی کی آنکھوں میں آنسو آگئے کوشلیا بیتاب ہوگئی۔ ہم بیمار بچّے کو آزردہ نہیں کرسکتے۔ اُس نے شادی کو پانی پلاکر لٹا دیا، اور کہا، دوا ذرا ٹھہر کر دونگی۔

شادی "ماں! (منّت سے) میرے ساتھ لیٹ جاؤ"۔

کوشلیا لیٹ گئی۔ شادی نے اپنا سراس کی چھاتی میں چھپا لیا اور اپنا ہاتھ اُس کے مُنہ پر رکھ دیا۔

ماں کی ممتا جاگنا چاہتی تھی، مگر قُدرت کے قاعدے اٹل ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد کوشلیا کو نیند آگئی، اب اُسے تن بدن کا ہوش نہ

تھا ادھر راجہ رام اپنی چارپائی پر کروٹیں بدلتے تھے۔ مگر اُن کو نیند نہ آتی تھی، وہی قدرت جس نے ماں کو سُلا دیا تھا باپ کو جگا رہی تھی۔ راجہ رام سونا چاہتے تھے، وہ سونے کی کوشش کرتے تھے مگر نیند اُن سے کوسوں دُور تھی۔ اُن کے دل میں گھبراہٹ تھی، سینہ میں آگ سی دہک رہی تھی، ایسی حالت میں نیند کہاں؟ آخر اُٹھ بیٹھے، مگر اپنی خواہش سے نہیں، کسی غیبی طاقت کے اشارہ سے، اُن کو معلوم نہ تھا کہ میں کیا کر رہا ہوں، کدھر جا رہا ہوں، لیکن اُن کے پاؤں چل رہے تھے جیسے اُن پر کسی نے مسمریزم کا عمل کر دیا ہو۔ وہ برہنہ بدن برہنہ پاؤں گھر سے نکلے اور اپنے قریبی مندر کی طرف روانہ ہو گئے ؛

رات کا وقت تھا، ایک بج چکا تھا چاروں طرف سنّاٹا تھا، لوگ اپنے اپنے بستروں پر سو رہے تھے، ماں کی آنکھیں بھی جھپک گئی تھیں، مگر باپ کی محبّت اُسے بیمار بیٹے کی سلامتی کے لئے پرارتھنا کرنے کو ننگے بدن ننگے پاؤں مندر کی طرف بھگائے لئے جا رہی تھی ؛

لیکن مندر کے دروازے بند تھے اور پجاری اپنی کوٹھری میں آرام کی نیند سو رہا تھا ؛

راجہ رام مندر کی سیڑھیوں پر اوندھے مُنہ گر پڑے اور بیٹے کی سلامتی کے لئے رو رو کر پرارتھنا کرنے لگے۔ اُن کے آنسوؤں سے سنگ مرمر کی سفید سیڑھیاں تر ہوگئیں ۔

یہ وہی بے پروا بے درد باپ تھا جسے اپنے بچّوں سے ذرا محبّت نہ تھی، جس نے اُن کو گود میں لے کر کبھی پیار نہ کیا تھا، جو صرف مارنا جانتا تھا۔ آج وہ رات کے اندھیرے اور سنّاٹے میں اپنے بچّے کی زندگی کے لئے اُونچے گھر والے نیلی چھت والے پرماتما سے پرارتھنا کرنے آیا ہے۔ اور اس حال میں کہ اُسے اپنے جسم کا بھی دھیان نہیں ۔

صبح کو جب کوشلیا کی آنکھ کھُلی تو ساڑھے سات بج چکے تھے، اُسے اپنے آپ پر غصّہ آیا کہ میں اتنی دیر کیوں سوئی رہی۔ تب اُس نے آہستہ سے شادی کی پیشانی پر ہاتھ رکھا اور اُس کی آنکھیں مسرّت سے چمکنے لگیں، شادی کا بخار اُتر چکا تھا اور وہ آرام سے سو رہا تھا۔ کوشلیا جلدی سے اُٹھ کر خاوند کو یہ خوشخبری سُنانے کے لئے اُس کے کمرے کی طرف دوڑی۔ مگر اُن کا بستر خالی تھا۔ جوتا۔ کمل۔ کپڑے سب وہیں تھے صرف راجہ رام نہ تھے۔ کوشلیا نے مکان کا چپّہ چپّہ ڈھونڈھا مگر اُن کا کہیں پتہ نہ تھا۔ یکایک اُس کی نگاہ زینے کی طرف گئی۔ دروازہ چوپٹ کھُلا تھا، کوشلیا کا کلیجہ دھڑکنے لگا۔

اتنے میں کہاری نے اُوپر آکر کہا "بھوجی! بابُوجی ننگے پاؤں، ننگے بدن مندر کی سیڑھیوں پر اوندھے مُنہ پڑے رو رہے ہیں، اور کسی کے اُٹھائے نہیں اُٹھتے، ہم نے آواز دی، اُنہوں نے سُنا ہی نہیں"۔

کوشلیا نے یہ خبر حیرت کے ساتھ سُنی، اور آنِ واحد میں اُس پر صُورتِ حال روشن ہوگئی۔ وہ ماں تھی، اُسے باپ کی محبّت پہچاننے میں ایک لمحہ کی بھی دیر نہ لگی۔ ....

.... آج اُسے معلوم ہُوا کہ جسے وہ چشمۂ خشک سمجھے ہوئے تھی درحقیقت گہرا ساگر تھا۔ اُوپر ریت تھی، نیچے پانی لہریں مارتا تھا۔ اُس نے ریت دیکھی، ریت کے نیچے پانی نہ دیکھا۔ مگر آج وہ پانی ریت کے پردے کو پھاڑ کر باہر چھلک رہا تھا جیسے فوارے سے پانی کی دھاریں پھُوٹتی ہیں۔ اُس کی آنکھوں میں فخر، محبّت، خوشی کے آنسو بہنے لگے، آج اُس کو ایسا معلوم ہُوا جیسے برسوں کی کمی آنِ واحد میں پُوری ہوگئی، آج اُس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا، آج وہ پھُولی نہ سماتی تھی، اُس کا شوہر اُس کی نگاہوں میں ایسا بلند، ایسا قابلِ احترام کبھی نہ تھا +

تھوڑی دیر بعد خاوند بیوی بچّے کے پاس بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔

کوشلیا: "بُرا نہ ماننا، مَیں آج تک یہی سمجھتی رہی کہ تم کو بچوں سے ذرا بھی محبت نہیں ہے"۔

راجہ رام: "اور اب"؟

کوشلیا: "اب نہیں۔ آج تمہارا اصلی رُوپ دیکھ لیا"۔

راجہ رام (مُسکرا کر) "یہ تو ہماری ایک چال تھی، کھا گئیں دھوکا"؟

کوشلیا: "چلو ہٹو، اب تمہاری باتوں میں نہ آؤں گی۔ کہتے ہیں چال تھی، کوئی اُس وقت مُنہ دیکھتا تو حیران رہ جاتا، کیسے بھاگے بھاگے گئے تھے، تن بدن کی سُدھ نہ تھی۔ دروازہ بھی کھلا چھوڑ گئے، کوئی چور چکار آجاتا تو سب کچھ اُٹھا کر لے جاتا، کیوں"؟

راجہ رام: "مگر جو چیز پالی، وہ گھر کے ساز و سامان سے کہیں قیمتی ہے بلکہ مَیں تو سمجھتا ہوں، اُس کے سامنے دُنیا بھر کے خزانے ہیچ ہیں"۔

کوشلیا کسی دوسری دُنیا میں پہنچ گئی، بولی "یہ محبت آج تک کہاں چھپی ہوئی تھی؟"

راجہ رام نے بیوی کی طرف مُسکرا کر دیکھا اور کہا "تمہارے دل میں"۔

ایک نامکمّل کہانی

(۱)

رام نواس - جالندھر
یکم جولائی ۱۹۱۵ء

میرے پیارے رادھاکرشن!

آخر بیاہ ہو گیا اور بڑی دھوم دھام سے، لوگ کہتے ہیں ایسا بیاہ ہمارے گاؤں میں تیس سال سے نہیں ہُوا۔ والد صاحب نے دل کھول کر خرچ کیا، ایسا معلوم ہوتا اِس وقت وہ اپنا تمام روپیہ پانی کی طرح بہا دیں گے، اپنا سب کچھ خرچ کر دیں گے۔ مَیں نے ایک مرتبہ دبی زبان سے کہا کہ آپ زیادہ خرچ کر رہے ہیں۔ اس پر مسکرا کر بولے تمہارا بیاہ ہے، تمہیں بولنے کا مجاز نہیں ہے چُپ چاپ دیکھتے چلو، اِس وقت مَیں کسی کی نہ سُنوں گا، پھر مجھے بولنے کا حوصلہ نہیں ہُوا۔

وہ خرچ کرتے تھے میں چپ چاپ تماشہ دیکھتا تھا۔ اس کے بعد برات پشاور پہنچی۔ لڑکی والوں نے ٹھیرنے کا ایسا اچھّا انتظام کیا تھا کہ تم سے کیا کہوں۔ کسی کو بھی شکایت کا موقعہ نہیں ملا، کاش تم آتے۔ تو دیکھتے کہ شادی کا کیسا انتظام کیا جا سکتا ہے۔ کیا مجال ہے کہ کسی نے کچھ مانگا ہو اور وہ چیز اُسی وقت مہیّا نہ کردی گئی ہو +

مگر مجھے صرف ایک ہی خیال تھا کہ دیکھیں بیوی صاحبہ کیسی ہیں جہیز ملے یا نہ ملے، لیکن بیوی اچھّی مل جائے۔ کہیں بدصورت نہ ہو، کالی نہ ہو، بھگوان! بچالینا، نہیں تو زندگی ہی برباد ہو جائے گی. بیاہ کا وقت آیا تو کلیجہ اِس طرح دھڑک رہا تھا جیسے امتحان کے موقعہ پر طالب علم کا کلیجہ دھڑکتا ہے۔ لیکن میرے تمام اندیشے بے بنیاد ثابت ہوئے، میں نے اُس کا ہاتھ دیکھا اور مطمئن ہوگیا ——— وہ خوبصورت تھی، کم از کم سیاہ فام نہ تھی۔ عورت کا ہاتھ دیکھ کر اُس کی شکل و صُورت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے جیسے اُونچا گھرانا ڈیوڑھی سے پہچانا جاتا ہے۔ تم ہنسو گے! ہنس لو، لیکن میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اپنے بیاہ میں تم بھی یہی کروگے ایک ہی چیز باقی ہے۔ پھر پُوچھوں گا۔ تاہم مجھے بڑی فکر تھی اور یہ فکر اُسی وقت تک دُور نہ ہوئی جب تک گھر پہنچ کر دیوی جی کے

درشن نہ کر لئے۔ گاؤں بھر کی عورتیں تعریف کرتی ہیں۔ کہتی ہیں ایسی خوبصورت بہو سارے گاؤں میں نہیں ؎

بیس دن ہوئے ہم دونوں یہاں آ گئے ہیں، بڑے لُطف سے کٹتی ہے۔ اب معلوم ہُوا زندگی کسے کہتے ہیں۔ بجیا نے مجھ پر جادُو کر دیا ہے۔ یہی جی چاہتا ہے، اُسے ہر وقت دیکھتا رہوں، کبھی آنکھوں سے اوجھل نہ ہونے دوں۔ نہایت سادہ لوح ہے، جب دیکھو مُسکرا رہی ہے، کبھی رنجیدہ نہیں ہوتی۔ مجھے بہت چاہتی ہے، کچہری سے لوٹتا ہوں تو دروازے پر کھڑی پاتا ہوں، اور ذرا بھی دیر ہو جائے تو پریشان ہو جاتی ہے۔ اُس کی آنکھوں سے محبّت چھلک پڑتی ہے۔ گویا آنکھیں کیا ہیں امرت کے کٹورے ہیں، ایسی بیوی پا کر میں اپنی خوش نصیبی پر پھُولا نہیں سماتا۔ کوئی محبّت چاہتا ہے، کوئی خوبصورتی۔ مجھے جنّت کی یہ دونوں برکتیں میسّر ہیں ؎

ایک پُر لُطف واقعہ سُنو، کل شام کے وقت کچھ دوست بیٹھے تھے اور اِدھر اُدھر کی باتیں کر رہے تھے۔ اتنے میں ایک صاحب بولے، پارسی الفریڈ کمپنی آئی ہے، چلو آج تماشہ دیکھیں۔ سب نے ہاں میں ہاں ملائی، لیکن میرا جی نہ چاہتا تھا میں نے انکار کر دیا۔ بس جناب اُن شُہدوں نے ایسے دلخراش طعنے مارے کہ تم سے کیا کہوں، آخر تیار ہو گیا

مگر سوچتا تھا بیوی اکیلی ہے، کیسے اجازت لونگا مجھے پس وپیش میں دیکھ کر ایک حضرت نے فرمایا، کیوں کیا بیوی سے ڈرتے ہو۔ ارے بھائی کوئی بہانہ بنا دو، میں بڑا چکرایا، جھوٹ کیسے بولوں دُوسرے صاحب نے فرمایا کچہری میں جج کے رُو برو اور گھر میں بیوی کے رُوبرو جو راست گفتاری سے کام لے اس سے بڑا احمق اور کون ہوگا؟ اِس پر سب ہنسنے لگے۔ مجبوراً جھوٹ بولنا پڑا۔ کہدیا آج رات سماج کی میٹنگ ہے، ایک دو بجے سے پیشتر نہ لوٹ سکوں گا تم سو رہنا، مُفت کی شب بیداری سے کیا حاصل؟ اِس غریب کو کیا علم تھا کہ یہاں کوئی دُوسری ہی میٹنگ ہے۔ قدرے اُداس ہو کر بولی "میں جاگوں گی"۔

ہم تھیٹر میں پہنچے، تماشہ شروع ہُوا۔ سب دوست مُسکراتے تھے قہقہے لگاتے تھے، ایکٹروں کے کام پر رائے زنی کرتے تھے، مگر مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کسی نے شانوں پر پتھّر رکھ دیئے ہیں، جیسے میرا دل بیٹھا جاتا ہے۔ ناٹک کی طرف ذرا بھی دھیان نہ تھا۔ آخر پہلے ڈراپ کا آخری منظر آیا، یہ منظر نہایت دردناک تھا۔ ایک بے پرواہ شرابی میخانہ میں بیٹھا اپنی دولت، اپنی انسانیت اپنے ہاتھوں سے تباہ و برباد کر رہا تھا اور گھر میں اُس کی نوعُمر وفا پرور بیوی جذبۂ محبت سے بیخود و بیتاب ہو کر اُس کی تصویر سے باتیں کر رہی تھی اور سمجھتی تھی کہ میرا شوہر

اپنے مالک کے ساتھ کاروبار کی نئی پالیسی کے متعلق بات چیت کر رہا ہے۔ مَیں چونک پڑا جیسے کسی نے میری پیٹھ پر تازیانہ دے مارا ہو۔ یہ فرضی ناٹک کا فرضی واقعہ نہ تھا۔ میں نے ناٹک کے آئینہ میں اپنا روئے سیاہ دیکھا، اور تلملا کر کھڑا ہو گیا۔ مجھے احباب روکتے رہ گئے مگر مَیں نے ایک نہ سُنی اور چلا آیا۔ گھر پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ لجیا لالٹین سامنے دھرے بیٹھی ہے اور اُونگھ رہی ہے۔ مَیں کٹ گیا، مجھے اپنے آپ سے نفرت ہو گئی، مجھے اُس کے قریب جانے، اُسے چھونے، اُسے ہاتھ لگانے کی جُرأت نہ ہوتی تھی۔ جیسے کیچڑ سے بھرے ہوئے پاؤں والا آدمی قیمتی غالیچہ کے قریب نہیں جاتا۔ مَیں نے زبان سے کچھ نہ کہا، مگر دل میں عہد کر لیا کہ اب لجیا سے کبھی جھوٹ نہ بولونگا۔

فکر نہ کرو، تمہارے بیاہ میں ضرور شامل ہونگا۔

تمہارا .....

پرتاپ

(۲)

رام نواس۔ جالندھر
۱۵۔ ستمبر ۱۹۱۵ء

پیارے رادھا کرشن جی!

خط موصول ہُوا، پڑھ کر حیرت ہوئی، آخر اس کا کیا مطلب کہ

ہماری بھابی صاحبہ کا ذکر خیر دو مختصر سی سطروں میں ختم کر دیا۔ خوبصورت ہیں، قد لمبا ہے، یہ باتیں تو بیاہ سے پہلے بھی معلوم ہو گئی تھیں۔ میں نے جو کچھ پوچھا تھا اُس کے بارے میں تو تم نے ایک بھی لفظ نہیں لکھا۔ اِدھر اُدھر کی باتوں میں دو صفحے سیاہ کر ڈالے۔ میں نے دریافت کیا تھا کہ مزاج کیسا ہے، تمہارے ساتھ رُوس جاپان کی جنگ تو نہیں چھڑی رہتی؟ سارا دن کیسے کٹتا ہے، کچھ گھر کا کام بھی کرتی ہیں یا محض ناول ہی پڑھنے کا شوق ہے۔ بتاؤ اِن سوالوں کا تم نے کیا جواب دیا۔ کچھ بھی نہیں۔ ایک ہم ہیں کہ اپنی "میم صاحب" کی ایک ایک بات لکھ دیتے ہیں اور پُوری تفصیل کے ساتھ۔

کھانا بنانے کے لئے ایک مُلازم رکھا تھا، لجیا نے نکال دیا، کہتی ہیں ہماری آزادی میں فرق آتا ہے۔ ہر وقت سہمے رہو، کہیں کچھ سُن نہ لے، کچھ دیکھ نہ لے۔ یہ جنجال کون پالے؟ بھٹ پڑے سونا جو چھیدے کان، میں نے بہت سمجھایا کہ تمہاری صحت خراب ہو جائیگی مگر جناب کون سُنتا ہے، اب سب کام اپنے "دستِ مبارک" سے کرتی ہیں اور ذرا نہیں تھکتیں، اور پھر لُطف یہ کہ کیا مجال جو کوئی بھی کام رُک جائے سارا گھر شیشے کی طرح چمکتا ہے۔ جب نوکر تھا ایسی صفائی اُس وقت بھی نہ تھی، میں روکتا ہوں اور وہ ہنس کر ٹال دیتی

ہیں، کہتی ہیں اپنا کام کرنے میں شرم کیسی؟ اپنے پیر تو رانیاں بھی دھولیتی ہیں، اور پھر ان سب کاموں کو ایسی عقیدت ایسے شوق سے کرتی ہیں گویا اپنے دیوتا کی پوجا کر رہی ہوں۔ ایک دن میں نے کہا اب میں تمہیں یہ ذلیل کام نہ کرنے دونگا، میں وکیل ہوں کہار نہیں ہوں، تم وہ کرتی ہو جو کہاریاں بھی نہ کریں۔ اس پر جوش میں آگئیں، اور ایک طُول طویل تقریر کرنے لگیں۔ بھائی صاحب! مجھ پر تو رُعب طاری ہو گیا میں سمجھتا تھا سیدھی سادی لڑکی ہے، مگر توبہ! یہ تو فلاسفر نکلی، ایسی ایسی باتیں کرتی ہے کہ میرے جیسے وکیل کا بھی مُنہ بند ہو جاتا ہے۔ پرماتما مجھے ایسی بیوی کے قابل بنائے۔

تمہارا دوست .....

پرتاپ

(۳)

رام نواس، جالندھر
۲۰۔ دسمبر ۱۹۲۹ء

بھائی جان!

خط ملا، پڑھ کر لطف آگیا، مجھے خواب میں بھی خیال نہ تھا کہ ہماری بھابی صاحبہ ایسی خوش مذاق ہونگی، مسز پرتاپ چند پڑھ کر بہت

دیر تک ہنستی رہیں، کہتی ہیں ایسا جواب دونگی کہ پڑھ کر چھٹی کا دودھ یاد آ جائے۔ ہم نے کہا، ہم ایسا جواب دینگے کہ ساتویں کا وہی یاد آ جائے۔

آپ نے کرسمس کے ہفتہ ہیں ہمیں دِلّی بُلّایا ہے، مگر بھئی! ہم دِلّی نہ آسکیں گے، ہماری سیر و تفریح یہاں ہو گی۔ لجیا کہتی ہے خُدا خُدا کر کے چار چھٹّیاں نصیب ہوئی ہیں، اب وہ بھی دِلّی آنے جانے ہیں کیسے اُڑا دیں، آپ کو بھی تکلیف ہو گی، منہ سے شاید کچھ نہ کہیں مگر دل میں ضرور گالیاں دیتے رہیں گے۔ اور بھابی صاحبہ تو جہاں تک ہیں آپ کے خطوط سے سمجھ سکا ہوں برملا کہدیں گی۔ تم بھی عجیب آدمی ہو۔ ہم نے مفت کرم داشتن کے مصداق ظاہر داری کی ایک چِٹّھی لکھ دی، تم جھٹ ٹکٹ لے کر گاڑی ہیں بیٹھ گئے، اتنا بھی خیال نہ کیا کہ ایک آدھ دفعہ تو انکار کر دیں۔ بتائیے اس وقت کیا جواب دُونگا؟ آپ تو سر کو کھُجلاتے ہوئے آسمان کی طرف دیکھنے لگ جائیں گے۔ مگر ہماری تو دو شریف عورتوں کے سامنے توہین ہو جائیگی"

نہ بھئی! یہ نہیں ہونے کا، ہفتہ کرسمس یہیں گزرے گا۔ صبح کے وقت صاحب بہادر اور میم صاحبہ کمپنی باغ کی سیر کریں گے دوپہر کو تاش کھیلیں گے۔ شام کو سینما ہال ہیں جا کر حُسن و عشق کے پُرلطف تماشے دیکھیں گے۔ اور رات کو گھر جا کر اُن کے خاص خاص حصّوں کی

نقل اُتاریں گے۔ فرمائیے! اس سے اچھی سیر اور کہاں ہو گی؟ دلّی میں کیا رکھا ہے۔ لال قلعہ اور قُطب صاحب کی لاسٹ اور چُھٹیوں کے رنگین دنوں کو برباد کرنے والا ایک بے دل بھائی، اور ایک کوتوال بھابی! اُفوہ!! ایسی حماقت کون کرے گا۔ کم از کم ایک وکیل سے تو ایسی توقّع نہ رکھئے گا، خواہ اُس کی وکالت ابھی تک نہ چمکی ہو۔

ہاں ایک بات کا مجھے اندیشہ ہے۔ لجیا کی چھوٹی بہن کنیا مہاودیالہ میں پڑھتی ہے، کرسمس میں اُسے بھی چھٹیاں ہوں گی کہیں وہ نہ آجائے، پرماتما اُسے عقل سلیم دے، ورنہ ہمارے تمام نیک ارادے مٹّی میں مل جائیں گے۔

تمہارا ....

پرتاپ

(۴)

رام نواس۔ جالندھر

۲۸- دسمبر ۱۹۱۵ء

مائی ڈیر رادھا کرشن! نمستے

جس بات کا اندیشہ تھا، وہی ہوئی، لجیا کی بہن شانتا ۲۴ تاریخ

سے یہاں ہے۔ اگر پہلے معلوم ہوتا تو سچ کہتا ہوں آپ کا نوید ضرور منظور کر لیتا۔ اور نہ ہوتا تو دِلّی کی سیر تو ہو جاتی، اور پھر آپ کے یہاں ہمیں اس ظاہرداری کی چنداں ضرورت نہ تھی جس کا اب ہمیں ہر وقت خیال رکھنا پڑتا ہے، کنواری لڑکی ہے اُس کی موجودگی میں بات کرتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔ ایک دن بیٹھا کھانا کھا رہا تھا لجیا نے میرے تھال میں میرے منع کرنے کے باوجود ایک روٹی پھینک دی، میرا پیٹ بھر چکا تھا ایک لُقمہ کی بھی جگہ نہ تھی، میں نے کہا مجھے تو اب بھوک نہیں"، اب یہ روٹی کون کھائے گا۔

لجیا نے آہستہ سے جواب دیا "آپ کھائیں گے"۔

مَیں "مجھے تو جو کچھ کھانا تھا کھا چُکا، اب ذرا بھی بھوک نہیں"۔

لجیا "کیسے کھا چکے؟ ایک ذرا سی روٹی ہے، کھا جائیے"۔

مَیں "نہیں میری رانی! اِس وقت تو معاف ہی کرو"۔

بس اِتنی سی بات پر خفا ہو گئی، کہ آپ نے میری بہن کی موجودگی میں یہ الفاظ کیوں کہے، وہ دل میں کیا کہتی ہو گی یہی کہ دونوں بےشرم ہو گئے ہیں۔ میرے سامنے بھی ایک دُوسرے سے مذاق کرنے سے نہیں چُوکتے۔ اور اگر اُس نے وِدیالہ میں اپنی سہیلیوں سے جا کر کہہ دیا تو غضب ہی ہو جائیگا۔ کہئے کیسی بدبختی ہے، کہ اپنے گھر میں بھی

پرائے بن کر رہو، کیا سوچا تھا کیا ہو گیا۔ اور شانتا اتنی سادہ لوح ہے کہ ان باتوں کو ذرا بھی نہیں سمجھتی رات کو بھی بہن کے ساتھ سوتی ہے، ہر گھڑی پاس بیٹھی رہتی ہے، اتنا بھی موقعہ نہیں ملتا کہ ہنس کر دو باتیں ہی کر لیں۔ اب اپنی یہ حالت ہے کہ کھیر کا تھال سامنے پڑا ہے، کھانے کو طبیعت للچا رہی ہے مگر آنکھ اُٹھا کر دیکھتے بھی نہیں کہ کہیں کوئی یہ نہ کہہ دے کمبخت بھوکا تھا دیکھتے ہی ٹوٹ پڑا۔ ہاتھ بڑھاتے بھی ہیں تو اِس انداز سے جیسے بھوک ہے ہی نہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ آنتیں قُل ھُوَ اللہ پڑھ رہی ہیں۔ اگر دُنیا اور دُنیا کی چھوٹی بہنوں کی پروا نہ ہوتی تو جناب یہ دن کیسے گزرتے اور اب ....

آپ پُوچھیں گے یہ دن کیسے گزُرتے ہیں؟ دفتر میں بیٹھا قانون کی خُشک کتابوں کے ساتھ سر پھوڑا کرتا ہوں، شام کے وقت ٹینس کھیلنے چلا جاتا ہوں، رات کو لوٹتا ہوں، کھانا کھاتا اور سو جاتا ہوں۔ لیکن شانتا کا آنا میں نے ہی نہیں لجیا نے بھی محسوس کیا ہے، ایک دن شانتا چھت پر ایک کتاب دیکھ رہی تھی لجیا نے ایک اشارہ سے مجھے اندر بُلایا، اور میرا ہاتھ محبّت سے اپنے ہاتھ میں لے کر بولی خفا کیوں رہتے ہو، آخر اس میں میرا تو کوئی قصور نہیں۔ میں نے

ایک دو مرتبہ اشارہ سے کہا بھی ہے، کہ یہاں رہنے میں تمہارا حرج ہوتا ہوگا، و دیا چلی جاؤ۔ مگر وہ اتنی سیدھی سادی ہے کہ ذرا نہیں سمجھتی۔ کہتی ہے، حرج ہوتا ہے تو ہوا کرے، ایک ہفتہ کے لئے بہن ملی ہے اُسے تو نہ چھوڑوں گی ⁂

میں۔ (لجیا کی ٹھڈی کو اُنگلی سے اُوپر اُٹھاکر) اگر یہ نہ آتی تو تاش کھیلتے، پیار محبّت کی باتیں کرتے۔ اور لجیا چونک کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی اور ہنس کر بولی، وہیں کھڑے رہیئے، آپ کا کیا اعتبار ہے، اُنگلی پکڑتے پہنچا پکڑتے ہو" ⁂

میں "کیوں لجیا! یہ کیوں نہیں کہتی کہ ہم روز و دیالہ آیا کریں گے" ⁂

لجیا "یہ تیر بھی خالی گیا۔ وہ کہتی ہے، تم میری بڑی بہن ہو، تمہیں تکلیف نہ دُونگی" ⁂

فرمائیے کیا کیا جائے، نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن! اُدھر آپ اور بھابی لال قلعہ اور قُطب صاحب کی لاٹھ کی سیر کر رہے ہونگے۔ آپ کا کہنا مان لیتے تو یُوں پچھتانا نہ پڑتا۔ مگر اب کیا ہو سکتا ہے ⁂

لیکن اتنا ہی نہیں، چند دن سے ایک اور فکر رہنے لگی، لاکھ کوشش کرتا ہوں، دل کو سمجھاتا ہوں مگر دل بے قرار کو قرار نہیں ملتا اب آپ سے کیا پردہ ہے، مجھے لجیا پر کچھ شُبہ سا ہو گیا ہے۔

چار پانچ دن گزرے شام کو گھر آیا تو لبجیا کچھ لکھ رہی تھی اور ایسے انہماک سے کہ اُسے میرے آنے کی خبر بھی نہیں ہوئی، شانتا چھت پر بیٹھی کچھ پڑھ رہی تھی، میرے دل میں خیال آیا کہ آگے بڑھ کر لبجیا کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دوں، چونک پڑے گی۔ مَیں کہوں گا، دیکھا تمہیں معلوم بھی نہ ہُوا۔ یہ سوچ کر میں نے پاؤں سے جُوتا نکال دیا اور دبے پاؤں آگے بڑھا، یکایک وہ چونک پڑی۔ اُس نے مجھے دیکھ لیا اور جھپٹ کر کاغذ چھپا لیا۔ میں اصرار کرتا تھا کہ دکھاؤ کیا لکھ رہی تھی، وہ کہتی تھی کبھی نہ دکھاؤں گی۔ مَیں نے پیار سے کہا، غصّہ سے کہا، دھمکی دی، ناراضگی کا اظہار کیا، لیکن اُس پر ان میں سے کسی بھی بات کا اثر نہ ہُوا خدا جانے کیا لکھ رہی تھی، ضرور کوئی خاص ہی بات ہو گی، ورنہ مجھ سے کیوں چھپاتی۔ ہار کر مَیں چُپ ہو رہا۔ مگر شک کی آگ دل میں سلگ رہی تھی ساری رات نیند نہیں آئی،

اب ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی قیمتی شے گم ہو گئی ہے یا جیسے دم گھٹ رہا ہے۔ دُنیا کی ہر ایک چیز بدلی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ صبح ایک دوست کے ہاں گیا تھا، لیکن وہاں بھی دلِ مضطرب کو سکون حاصل نہ ہُوا، لاکھ کوشش کرتا ہوں کہ کسی طرح یہ وہم دُور ہو جائے مگر گناہ کے داغ کے مانند یہ وہم بھی دُور نہیں ہوتا، کیا کروں، جانتا

ہوں کہ یہ وہم کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے مگر پھر بھی دل میں آگ سی سلگ رہی ہے۔ جب تک وہ کاغذ دیکھ نہ لونگا چین نہ آئیگا۔

آپ کا غمزدہ بھائی....

پرتاپ

(۵)

رام نواس، جالندھر
۳- جنوری ۱۹۱۶ء

بھائی جان!

آپ کی چِٹھی ملی، لیکن اب مجھے سمجھانا بیکار ہے۔ جو ہونا تھا ہو چکا۔ آپ کا خیال ہے میرا دماغ چل گیا ہے، آپ سمجھتے ہیں وہ نہایت نیک عورت ہے۔ میرا بھی یہی خیال تھا، اے کاش ایسا ہوتا تو اس وقت مَیں ایسا غمگین، ایسا بیتاب و مضطرب نہ ہوتا۔ آپ کو یہ پڑھ کر افسوس ہوگا کہ کل بجیا اس دُنیا سے چل بسی، لیکن مجھے اس کا ذرا بھی افسوس نہیں ہے۔ ہاں اگر نہ مَرتی تو افسوس ہوتا۔

وہ خط میں نے پڑھ لیا۔ شام کا وقت تھا بجیا شانتا کو ودیالہ چھوڑنے گئی تھی، میں نے میدان صاف پاکر میز کی دراز کھولی، مجھے امید نہ تھی کہ وہ کاغذ وہاں ہوگا۔ سمجھتا تھا وہ ایسی بیوقوف، ایسی

نا عاقبت اندیش نہ ہو گی، کہ اِس قسم کی لاپروائی سے کام لے۔ مگر وہ کاغذ وہیں تھا، اسی طرح، نہ لپٹا ہُوا نہ تہ کیا ہُوا۔ میں نے اُسے پڑھا اور میرا سر چکرانے لگا۔ یہ کاغذ معمولی کاغذ نہ تھا، لجیا کا اقبالِ جُرم تھا یہ چِٹھی نہ تھی میری محبّت کی بربادی کی داستان تھی۔ مَیں نے سر پیٹ لیا۔ کسے خبر تھی؟ کہ لجیا ایسی نیک کردار، شیریں زبان، محبّت کرنے والی عورت ایسی سیاہ کار ہو گی۔ کسی دُوسرے کی زبان سے یہ الزام سُن کر مَیں اُس کا مُنہ نوچ لیتا، مَیں اُس کی گردن مروڑ دیتا۔ مگر اب شک کی گنجائش نہ تھی —— لجیا کے اپنے ہاتھ کی تحریر میرے سامنے تھی، اور میں نے اُسے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ یہ چِٹھی کسی من موہن کے نام تھی۔ لکھا تھا "پیارے من موہن! بیاہ ہو گیا، مگر مَیں اب بھی تمہاری ہوں۔ میرا شوہر مجھے بہت چاہتا ہے۔ میری ہر ایک خواہش کو پُورا کرنا اپنا فرض سمجھتا ہے۔ لیکن تمہیں کیونکر یقین دلاؤں کہ مجھے اُس کی شکل سے بھی نفرت ہے، اُسے دیکھ کر مجھے زہر چڑھ جاتا ہے۔ اگر اپنے بس کی بات ہوتی تو ایک دن میں بھاگ کھڑی ہوتی اور تمہارے پاس پہنچ جاتی، مگر کیا کروں اپنی اور تمہاری بدنامی کے خوف سے چُپ ہوں۔"

بھئی! یہ خط پڑھ کر میرے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ مَیں

کرسی پر بیٹھ گیا، نہیں بیٹھا نہیں گر پڑا اور پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ ایسی شدّت سے میں اپنی عمر میں آج تک نہ رویا ہونگا۔ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ میں جس عورت پر اپنی جان نثار کرتا تھا۔ جس کی محبّت میرے تاریک دل کی روشنی تھی، جس کی مسکراہٹ دیکھ کر میرے جسم کا رویاں رویاں خوش ہو جاتا تھا۔ وہی عورت کسی دوسرے پر مرتی ہے، اور میں بھی کیسا احمق تھا کہ مجھے شبہ تک نہ ہُوا وہ دروازہ پر کھڑی ہو کر میرا انتظار کرتی تھی۔ وہ مجھے دیکھ کر خوشی سے جھومنے لگ جاتی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو جاتی تھی۔ مگر محبّت کے یہ تمام تماشے محض اس لئے تھے کہ مجھے اُلّو بنایا جائے۔ پرماتما جانے اِسی چھت تلے بیٹھ کر اُس نے اپنے ناپاک و ملعون ہاتھوں سے اِسی قسم کے اَور کتنے شرمناک خط لکھے ہونگے۔

تھوڑی دیر بعد وہ آگئی۔ اُس کے چہرہ پر اس وقت بھی وہی سادگی تھی۔ آنکھوں میں وہی پیار، مگر اب میں پاگل نہیں ہو گیا۔ میں نے اس کا دل دیکھ لیا تھا۔ اُوپر پانی کی لہریں کھیلتی تھیں نیچے خوفناک گھڑیال بیٹھا تھا۔ جب تک گھڑیال نہ دیکھا تھا تب تک دھوکا کھا گیا لیکن اب میں نے اصلیت دیکھ لی تھی۔ لجیا نے میرے تیور دیکھے اور ڈر گئی، اُس نے مجھے منانا چاہا، میری خفگی کی وجہ

پوچھی، مگر میں نے اُسے جھڑک کر پرے ہٹا دیا۔ اب وہ رو رہی تھی،
اور ایسے جیسے اُس پر دُنیا کی سب سے بڑی مصیبت ٹوٹ پڑی ہو۔
مگر مَیں سمجھتا تھا۔ اُس کی محبّت کی طرح یہ گریہ وزاری بھی دھوکا تھی اور
مجھ پر اس کا ذرا بھی اثر نہ ہُوا۔ چند دن قبل اُس کی آنکھوں میں آنسو
دیکھ کر میرا اطمینان قلب زیر وزبر ہو جاتا۔ مَیں جوشِ جنوں میں اُٹھ کر
باہر نکل گیا، وہ روکتی ہی رہ گئی۔ مگر مَیں نے اُسے دھکا دے کر
گرا دیا اور باہر چلا گیا۔ وہ بڑے زور سے زمین پر گری، مَیں نے
پروا نہ کی۔ جیسے ہم کسی گلے سڑے پھل کو خود اپنے ہاتھ سے اُٹھا کر
پرے پھینک دیتے ہیں +

رات کو گیارہ بجے مَیں گھر آیا وہ باورچی خانہ میں بیٹھی میرا انتظار
کر رہی تھی۔ پر مجھے بھُوک نہ تھی۔ مَیں نے اُسے صاف کہہ دیا کہ مجھے
بھُوک نہیں۔ کیسی مکّارہ عورت تھی اُسوقت بھی اِس طرح روئی جیسے اُس کا دل
ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا ہے، مگر مَیں اُس کے چھل کو خوب سمجھتا تھا۔ دوسرے
دن صُبح کو اُٹھا، تو وہ بستر پر مُردہ پڑی تھی۔ رام جانے زہر کھا لیا دل
کی دھڑکن بند ہو گئی۔ بہرحال اِس خوبصورت ناگن سے میرا پیچھا چھوٹا۔
اُسے پا کر جتنا خوش ہُوا تھا اُسے کھو کر اس سے بھی زیادہ خوش ہُوا +

آپ کا پرتاپ

(۶)

رام نواس ۔ جالندھر
۵ ۔ جنوری ۱۹۱۶ء

پیارے بھائی!

آپ کا خیال صحیح نکلا، میں شُبہ ہی شُبہ میں تباہ ہو گیا، میں نے اپنے ہاتھ سے اپنی سونے کی لنکا جلا کر خاک سیاہ کرلی۔ وہ نیک تھی، وہ معصوم تھی، وہ پاک و صاف تھی۔ وہ محبّت کی پُتلی تھی، مگر میری ہی آنکھوں پر غفلت کے پردے پڑ گئے تھے، مَیں ہی اندھا ہو گیا تھا کاش اُس وقت ذرا بھی عقل سے کام لیتا تو آج یُوں ہاتھ نہ ملنے پڑتے لیکن اب کیا ہو سکتا ہے جو ہونا تھا جو نہ ہونا چاہئے تھا وہ ہو گیا۔ پہلے چھپایا تھا اب نہ چھپاؤں گا، نہ چھپانے سے کچھ فائدہ ہے۔ بیچاری نے زہر نہیں کھایا، نہ اُس کے دل کی دھڑکن بند ہوئی، اُس کا قاتل مَیں ہوں اُسے خود مَیں نے ہلاک کیا ہے۔ میرے، ہاں اے میرے دوست! میرے ہی ناپاک ہاتھوں کی ناپاک اُنگلیوں نے اُس کا گلا گھونٹ دیا رات کا وقت تھا وہ سارے دن کی پریشانی سے تھک کر سو گئی تھی، اُس کے گُل رنگ رُخساروں پر اُس کے آنسوؤں کے نشان ابھی تک باقی تھے، اُس کا ایک ہاتھ سر کے

نیچے تھا دُوسرا سینہ پر تھا، چہرہ پر فکر و تردّد کے آثار تھے۔ مگر اس کے باوجود اُس کی دلفریب خوبصورتی سے تمام کمرہ منوّر ہو رہا تھا۔ جیسے چاند کی چاندنی بادلوں کے پیچھے سے بھی پھُوٹ پھُوٹ کر نکلتی ہے۔ پر یہ وہ ناٹک کی بجلی نہ تھی جس سے آنکھیں چندھیا جاتی ہیں، یہ وہ صُبح کی روشنی تھی جس سے آنکھوں میں طراوت آتی ہے مگر جس کی آنکھیں دُکھتی ہوں اُس کو روشنی میں ایسی اذیّت ہوتی ہے جیسے آنکھوں میں پسی ہوئی لال مرچیں پڑ جائیں میرا بھی یہی عالم تھا۔ اُس کا حُسن مجھے اُس وقت سب سے بُرا معلوم ہوا۔ میرا خُون کھول رہا تھا۔ مَیں آہستہ سے اُس کی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ معاً اُس کی آنکھ کھُل گئی۔ اُس نے مجھے محبّت کی ادھ کھُلی آنکھوں سے دیکھا اور پھر اپنا ہاتھ میری طرف بڑھا دیا۔ گویا مجھے منانے کے لئے آخری مرتبہ کوشش کی۔ اب میں ضبط نہ کر سکا۔ مَیں نے اپنا ہاتھ چھُڑا لیا۔ اور اُس کا گلا پکڑ کر اُسے اپنے جسم کی پُوری قوت سے دبایا۔ اُس کی آنکھیں باہر نکل آئیں۔ اُن میں خوف نہ تھا حیرت تھی یقیناً وہ سمجھ نہ سکی تھی کہ مَیں کیا کر رہا ہوں اور اُس کی کیا تقصیر ہے وہ گلا چھُڑانے کے لئے جدوجہد کرتی تھی اور مَیں وحشیانہ انداز سے اُسے اور بھی زور سے دباتا جاتا تھا، یہاں تک کہ اُس کی جدوجہد

ختم ہو گئی، اور اُس کے ساتھ ہی اُس کی مختصر زندگی کا بھی خاتمہ ہو گیا اب چارپائی پر وہ نہ تھی اُس کی لاش تھی۔ چند دن پہلے اس منحوس ساعت کا تصوّر ہی میرے دماغ کو بیکار کر دینے کو کافی تھا، لیکن اس وقت میں ایسا خوش تھا جیسے قمار باز کوئی بہت بڑا داؤ جیت لے حالانکہ یہ جیت نہ تھی، میری زندگی کی سب سے بڑی ہار تھی +

اس کا علم مجھے کل دوپہر کے وقت ہوا۔ شانتا کی کچھ کتابیں میرے ہاں پڑی تھیں، وہ لینے آئی، بہن کا گھر تھا بہن نہ تھی شانتا سسک سسک کر رونے لگی۔ اُسے روتا دیکھ کر میں بھی آبدیدہ ہو گیا، رومال نکال کر مُنہ پونچھنے لگا تو جیب سے ایک کاغذ گر پڑا۔ یہ وہی کاغذ تھا، جس نے مجھ پر لجیا کا رازِ عشق آشکار کر دیا تھا، جسے دیکھ کر میں دیوانہ ہو گیا تھا جو لجیا کی بے وفائی کا زندہ ثبوت تھا۔ شانتا نے اُسے اُٹھا لیا اور ایک اُچٹتی ہوئی نگاہ سے اُسے دیکھ کر آہ سرد بھری +

مجھے تعجب ہُوا ——— کیا یہ بھی جانتی ہے۔ میں نے کانپتے ہوئے کہا "شانتا!"

شانتا نے اپنی اشک آلود آنکھیں اُوپر اُٹھائیں اور بے پروائی سے میری طرف دیکھا۔ مگر اُن میں سوا بہن کی موت کے رنج کے اور یاس و حرماں کے اور کچھ بھی نہ تھا +

مَیں " کیا تُو نے یہ کاغذ دیکھا ہے "؟

شانتا نے سر کے اشارہ سے کہا " ہاں دیکھا ہے "۔

اور وہ اب بھی اُسی طرح مطمئن تھی، جیسے وہ محض سادہ کاغذ تھا مگر میرا دل باز کے پنجہ میں پھنسے ہوئے کبوتر کے مانند تڑپ رہا تھا۔

مَیں " یہ تمہاری بہن کی تحریر ہے "؟

شانتا " یہ اُس کی کہانی کا ابتدائی حصّہ ہے "۔

میں نے شانتا کے یہ الفاظ سُنے مگر اُن کے معنی نہ سمجھ سکا، تاہم مجھے اتنا احساس ہو گیا کہ مجھ سے کوئی خوفناک غلطی سرزد ہو گئی ہے اُس وقت میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا، اور میرے کان اُس آواز کو بخوبی سُن رہے تھے۔ میں نے زخمی پرندہ کے سے اضطراب سے پوچھا " شانتا! تُو نے کیا کہا ہے "؟

شانتا نے عجیب انداز سے میری طرف دیکھا، اور اپنی بہن کی یاد میں ایک آہ سرد بھر کر جواب دیا " جیجا جی! تم سے کیا کہوں۔ بہن نے یہ کہانی بڑے شوق سے لکھنا شروع کی تھی، یہ کہانی خطوط میں تھی اور یہ اس کا پہلا خط تھا۔ بہن کا ارادہ تھا کہ اسے چھ خطوط میں ختم کیا جائے، اور پھر کسی ماہوار رسالہ میں بھیج دیا جائے۔ میں نے کہا جیجا جی سے بھی مشورہ کر لو مگر اُس نے کہا، دُر پگلی! اُن سے مشورہ کر کے لکھا

تو سارا لُطف جاتا رہے گا، لُطف جب ہے کہ اُن کو معلوم بھی نہ ہو اور کہانی کسی رسالہ میں شائع ہو کر سامنے آجائے، دنگ رہ جائیں گے کہیں گے یہ تُو نے لکھی ہے۔ مجھے تو خیال بھی نہ تھا کہ تو کہانیاں بھی لکھ سکتی ہے لیکن کسے خیال تھا کہ موت گھات میں ہے، کہانی ختم نہ ہوئی وہ خود ہی ختم ہو گئی "۔

میں تڑپ کر کھڑا ہو گیا ـــــ تو وہ بے وفا نہ تھی، میں ہی اندھا ہو گیا تھا۔ مجھے اُس کی ایک ایک بات یاد آ گئی۔ وہ معصوم بھولا بھالا چہرہ، وہ سادگی، وہ درد و غم میں ڈُوبی ہوئی حیرت، وہ بے بسی سب کچھ آنکھوں میں پھر گیا۔ دمِ واپسیں اُس نے میری طرف جن نگاہوں سے دیکھا تھا اُس کی یاد نے میرے دل میں بھالے چبھو دئے، کیسی بیوی تھی جس پر جنّت کی دیویوں کو بھی رشک ہوتا۔ میں اُس کے قابل نہ تھا، مجھے اُس کی پرستش کرنا چاہیئے تھی۔ مگر میں نے اپنے قہرمان ہاتھوں سے اُس معصوم کا گلا گھونٹ دیا اور پرماتما کا انصاف دُنیا کی اس سب سے بڑی بے انصافی کو چُپ کی نگاہوں سے دیکھتا رہا اور اُس میں حرکت نہ ہوئی۔

اِس وقت رات ہے، کمرہ کا لمپ روشن ہے مگر میرے دل کا لمپ ٹوٹ کر مٹّی میں مل گیا ہے۔ بعض وقت ایسا خیال گزرتا ہے گویا

وہ باورچی خانہ میں کھانا تیار کر رہی ہے، ابھی آئیگی، ابھی کرسی کے پیچھے کھڑی ہو جائے گی۔ وہی شیریں، وہی ملائم، وہی محبت کے رس میں ڈوبی ہوئی آواز پھر سُنائی دے گی۔ یقین ہی نہیں ہوتا کہ وہ مر چکی ہے۔ مَیں ابھی ابھی اُٹھ کر باورچی خانہ کی طرف گیا۔ وہاں روشنی تھی، کوئی کھانا بنا رہا تھا، تو کیا قُدرت کے نہ بدلنے والے قوانین بدل گئے، میرا دل دھڑکنے لگا۔ جلدی سے آگے بڑھا مگر وہاں وہ نہ تھی ایک پہاڑی نوکر کھانا بنا رہا تھا۔ جو میرے ایک کیل دوست نے بھیج دیا تھا۔ مَیں روتا ہُوا لوٹ آیا یقین ہو گیا کہ میری لجیا سچ مچ اِس دُنیا میں نہیں ہے۔ اگر ہوتی تو اپنے باورچی خانہ میں کسی دُوسرے کو پاؤں نہ رکھنے دیتی، وہ اِس کی کبھی اجازت نہ دیتی، یہ اس کی فطرت کے خلاف تھا۔ افسوس! محبت کا یہ افسانہ کتنی جلدی ختم ہو گیا!

وہ میز اُسی جگہ پڑا ہے، وہ کرسی بھی وہیں پڑی ہے جس پر بیٹھ کر اُس غریب نے وہ کہانی لکھنی شروع کی تھی، قلم دوات، کاغذ سب کچھ وہیں ہے، صرف وہی نہیں ہے۔ صندوق میں اُس کے ہاتھ کے تہ کیئے ہوئے کپڑے اُسی طرح رکھے ہیں۔ کھونٹی پر اُس کی ساڑھی لٹک رہی ہے۔ کپڑا سینے کی مشین میں آدھی سِلی ہوئی قمیص اُس کی آمد کا انتظار کر رہی ہے۔ مگر وہ کہاں چلی گئی۔ مَیں نے وہ قمیص

اُٹھا کر سینہ سے لگالی۔ اور پھُوٹ کر رونے لگا ﴿

اب نو بج گئے ہیں، دس بجے کی گاڑی سے میرے اور اُس کے والدین آ رہے ہیں۔ اُن کو رُوئے سیاہ کیوں کر دکھاؤں گا۔ جب پُوچھیں گے لجیا کہاں ہے تو کیا جواب دُوں گا۔ اُس کی ناگہانی موت کی کیا وجہ بتاؤں گا۔ پرماتما کرے وہ وقت کبھی نہ آئے۔ مگر دیوار کی گھڑی کی ٹِک ٹِک کی مدھم آواز کے ساتھ وقت گزُر رہا ہے اور تھوڑی دیر کے بعد یہ گھنٹہ بھی گزُر جائیگا تو اُس وقت میں کیا کروں گا مگر نہیں یہ نہیں ہونا چاہیئے، یہ نہیں ہوگا، یہ نہیں ہوسکتا۔ کمبخت سنگ دل گھڑی اُس دن بھی اِسی طرح ٹِک ٹِک کرتی رہی۔ میں نے اُس معصُوم کا گلا گھونٹ دیا اور یہ ٹِک ٹِک کرتی رہی۔ وہ تڑپ کر ٹھنڈی ہوگئی، اور اُس کی ٹِک ٹِک نہ رُکی۔ آج بھی یہ اُسی طرح ٹِک ٹِک کر رہی ہے اور ایک دو گھنٹے کے بعد بھی جب میرے اور اُس کے والدین ہم دونوں کی پُر اسرار مرگِ ناگہانی پر سینہ کوبی کر رہے ہونگے اس کی ٹِک ٹِک اِسی طری جاری رہے گی ﴿

تمہارا بدنصیب تھوڑی دیر کا مہمان

"پرتاپ"

دُوسروں کی طرف دیکھ کر

(۱)

کچھ زمانہ گزرا کانپور میں ایک بڑے زبردست اور رنگین بیان شاعر رہتے تھے، منشی ایشور سرن خیال۔ عمر تو کچھ زیادہ نہ تھی لیکن جب قلم ہاتھ میں لیتے تو سماں باندھ دیتے تھے۔ اُن کی ترکیبیں، اُن کی بندشیں، اُن کی تخیل سب اچھوتی تھی۔ لوگ اُن کی نظمیں سُن کر تڑپ اُٹھتے تھے۔ ناممکن تھا کہ کوئی مشاعرہ ہو اور اُس میں حضرت خیال کو مدعو نہ کیا جائے۔ اُن کے ایک ایک مصرع پر تحسین و آفریں کی صدائیں بلند ہوتی تھیں۔ وہ محفل کو زیروزبر کر دیتے تھے، اُن کے بعد کسی دُوسرے کا رنگ نہ جمتا تھا۔ اس لئے اُن کی باری سب کے بعد آتی تھی۔ یُوں تو کسی چینی کے کارخانے میں مُلازم تھے، تنخواہ بھی زیادہ نہ تھی صرف چالیس پینتالیس پاتے تھے اور اسی پر شاکر

تھے۔ اکثر کہا کرتے تھے، یہ دولت نہیں تو کیا ہُوا، قدرت نے دُنیائے سُخن کی دولت بے بہا دینے میں تو بُخل و تنگ دلی سے کام نہیں لیا۔ اب دُنیا کی ہر ایک شئے ہر ایک آدمی کو کیونکر میسّر آ جائے جب بازار میں نکلتے اور لوگ اُنہیں دیکھ دیکھ کر سرگوشیاں کرتے کہ یہ خیال صاحب جا رہے ہیں تو جناب پر وارفتگی کا عالم طاری ہو جاتا۔ اُس وقت اُنہیں ایسا معلوم ہوتا جیسے وہ آسمان کی بلندیوں میں اُڑے چلے جا رہے ہیں، اور دُنیا کے دُوسرے لوگ بہت نیچے حقیر کیڑوں کے مانند رینگ رہے ہیں۔ بادۂ شُہرت کا نشہ کتنا تیز، کیسا مخمور کر دینے والا ہے۔ لیکن اُن کو ایک امر کا بے حد ملال تھا۔ اُن کی شریکِ حیات اُن کی اِس شُہرت کی حصّہ دار نہ تھی وہ دل سے بھاگیرتھی پر جان دیتے تھے، اُسے دیکھ کر اُن کے بحرِ دل میں سرور انبساط کی موجیں اُٹھنے لگتی تھیں۔ اُس کی آواز اُن کے لئے نغمۂ رُوح تھی اس کی مُسکراہٹ اُن کے دل کا صبر و قرار۔ کہتے بھاگیرتھی میری نظموں کی رنگینی اور دلکشی اور جدّت کا سرچشمہ تُو ہے۔ لیکن بھاگیرتھی کا یہ سرچشمۂ تنویر ایشور سرن کے لئے تھا، اپنے لئے نہ تھا۔ جیسے چراغ دُوسروں کو روشنی دیتا ہے لیکن اُس کے تلے سدا تاریکی چھائی رہتی ہے۔ ایشور سرن چاہتے تھے بھاگیرتھی بھی شعر کہے، اُس کی نظمیں اخبارات و رسائل میں شائع ہوں

اور وُہ دیکھ دیکھ کر مسرور شاداں ہوں۔ اُن کے احباب کہیں، یار! تم خوش نصیب ہو جو ایسی بیوی ملی۔ واہ وا! کیا خوب لکھتی ہے۔ پڑھ کر آنکھیں کھُل جاتی ہیں۔ ادھر ہماری عورتیں بھی ہیں کہ کبھی کوئی شعر پڑھ دیں تو مُنہ تاکنے لگتی ہیں۔ یہ خیال کیسے رُوح پرور تھے، کیسے نشاط انگیز۔ ایشور سرن اُس دن کے لئے تڑپ رہے تھے وہ اُس کے لئے اپنا سب کچھ قُربان کرنے کو بھی آمادہ تھے۔

مگر بھاگیرتی نظمیں سمجھتی تھی، کہتی نہ تھی، اُس کے باپ کو لڑکیوں کو پڑھانے کا شوق تھا بھاگیرتی کو اُنہوں نے ہندی اُردو کی اعلیٰ تعلیم دلائی تھی۔ اس کے بعد اُسے ایشور سرن جیسے شاعر نکتہ رس کے آغوشِ محبّت میں جگہ ملی، سونے پر سہاگہ ہو گیا۔ چند ہی دنوں میں اُردو کے اچھے اچھے شاعروں کا کلام سمجھنے لگی۔ اُس کا شاعرانہ مذاق دیکھ کر ایشور سرن اُچھل پڑتے تھے۔ لیکن اب اسے کیا کہا جائے کہ وہ شعر کہہ نہ سکتی تھی۔ ہم روز تصویریں دیکھتے ہیں، اچھّی تصویر کی تعریف کرتے ہیں، بُری کو دیکھ کر ناک بھوں چڑھاتے ہیں۔ مگر ہم میں ایسے آدمیوں کی تعداد کتنی ہے جن میں تصویریں بنانے کی قابلیت بھی ہو۔ منشی ایشور سرن اس موٹی بات کو بھی نہ سمجھتے تھے۔

(۲)

ایک دن منشی صاحب شام کو دفتر سے لوٹے تو اُن کے ہاتھ میں ایک رسالہ تھا۔ آتے ہی بھاگیرتھی سے بولے "بھاگیرتھی! ایک غضب کی نظم ہے دیکھو گی؟"

بھاگیرتھی اس وقت دُھلے ہوئے کپڑے الگ الگ کرکے صندوق میں رکھ رہی تھی، اُس نے مُنہ پھیر کر اپنے شوہر کی طرف دیکھا اور مُسکرا کر جواب دیا "پہلے یہ کپڑوں کی نظم تو ختم ہو لے، پھر وہ بھی دیکھ لُوں گی۔ کون سا رسالہ ہے؟ یہ کہہ کر بھاگیرتھی پھر کپڑے سنبھالنے لگی۔

"ہزار داستان"۔

"آپ کی نظم شائع ہو گئی؟"

"ہاں ہو گئی، مگر میں تمہیں ایک اور ہی نظم دکھانا چاہتا ہوں"۔

"کس کی ہے؟"

"کوئی عورت برج کماری حیا ہے، اُس کی ہے"۔

بھاگیرتھی نے صندوق کے ایک کونے میں کپڑوں کے لئے جگہ بناتے ہوئے کہا "کوئی نئی عورت معلوم ہوتی ہے۔ میں نے یہ نام اس سے پہلے کبھی نہیں سُنا"۔

"مگر نظم نہایت شاندار ہے، دیکھو گی تو خوش ہو جاؤ گی"۔

بھاگیرتھی نے کپڑے وہیں چھوڑ دیئے، اور لپک کر رسالہ شوہر کے ہاتھ سے چھین لیا، ایسے اشتیاق سے کوئی عورت زیوروں کے ڈبے پر بھی کم لپکی ہوگی۔ بھاگیرتھی جوں جوں نظم پڑھتی جاتی تھی اُس کے چہرے کا رنگ شگفتہ ہوتا جاتا تھا۔ منشی ایشور سرن نے کوٹ اُتار کر کھونٹی سے لٹکا دیا اور پوچھا کیوں بھاگیرتھی! کیسی نظم ہے؟ بولو؛

بھاگیرتھی نے نسوانی انداز سے سر کو جنبش دی اور آہستہ سے کہا۔ "اچھی ہے، بہت اچھی ہے۔ آنکھوں کے سامنے تصویر پھر جاتی ہے"؛

"بس بس! میری بھی یہی رائے ہے، اچھا اگر تم ممتحن ہو، تو اِس کو کتنے نمبر دو؟"

بھاگیرتھی پاؤں پھیلا کر کھڑی ہوگئی، اُس کے بعد اس نے رسالہ لپیٹ کر دونوں ہاتھ کمر کے پیچھے کر لئے اور نہایت سنجیدگی سے سوچنے لگی منشی صاحب نے کہا۔ مگر یہ صرف مجھ کماری حیا کا امتحان نہیں ہے، تمہارا بھی ہے"؛

بھاگیرتھی نے مصنوعی انداز سے ممتحنوں کا سا چہرہ بنایا۔ اور جواب دیا، میم صاحبہ کی رائے میں یہ لڑکی دس میں سے چھ نمبر کے قابل ہے"؛

"ارے! تو چار نمبر کاہے کے کاٹ لئے"؛

"اگر اور نمبر دیدیتی تو خود فیل ہو جاتی۔ تم کہتے کیسی اچھی ہے۔ چار

رنگین لفظ دیکھ کر عقل ماری گئی، اور پھر اگر اُسے اور نمبر دیدیتی تو تمہیں کیا دیتی۔ اچھّا اب بیٹھ جاؤ کھڑے کب تک رہوگے؟"

یہ کہہ کر بھاگیرتھی نے عہدِ طفلی کی سادگی سے شوہر کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے اور اُنہیں کھینچتے ہوئے اندر لے جاکر چارپائی پر بٹھا دیا۔ اس کے بعد خود بھی پاس ہی بیٹھ گئی، اور اُن کے کندھے پر محبت سے سر رکھ کر بولی "شاعر صاحب کا دل اس وقت کہاں ہے؟"

"بڑی دُور"

بھاگیرتھی نے بناوٹی غصّے سے سر اُٹھا کر اُن کی طرف دیکھا اور پُوچھا "بڑی دُور کہاں؟ شریمتی دیوی بھاگیرتھی جی پاس ہیں تو دل کیوں دُور ہے؟ آخر اس کا کوئی سبب؟"

محبت کی اس سادگی پر منشی ایشور نرائن لوٹ پوٹ ہو گئے انہوں نے بھاگیرتھی کو پکڑ کر گلے سے لگا لیا۔ اور اُس کے خوش رنگ گالوں پر محبّت کی دو مُہریں ثبت کر کے جواب دیا "اب بہت قریب ہے"

بھاگیرتھی شرما کر پرے سرک گئی، اور بولی "جاؤ ہٹو! تم بہت کھوٹے ہو۔ ہم اپنی نظم پڑھیں گے"

"یہ کہہ کر اُس نے "ہزار داستان" میں خاوند کی نظم پڑھنا شروع کر دیا"

(۳)

یکایک منشی ایشور سرن نے بھاگیرتھی کے ہاتھ سے رسالہ لے کر اور اُس کے صفحے اُلٹ کر کہا، تم نے دیکھا۔ ایڈیٹر نے حیا کی کس قدر تعریف کی ہے؟

"ہم حیاؔ کی یہ پہلی نظم دُنیائے ادب میں پیش کرتے ہوئے بے حد خوش ہیں، اور ہمیں اس امر کا بجا طور پر فخر ہے کہ ایسی باکمال اور بلند خیال شاعرہ کو اُردو دُنیا سے روشناس کرانے کی خوش نصیبی ہمیں میسّر ہوئی۔ اگر صبح کے وقت آفتاب کی شعاعِ اوّلین کو دیکھ کر اُس کی تنویر کا اندازہ کیا جا سکتا ہے تو ہم وثوق کے ساتھ پیشینگوئی کر سکتے ہیں کہ یہ سحر کار خاتون مستقبل قریب میں بیسویں صدی کی دُنیائے شاعری کی ملکہ ہوگی، اور اُردو دان اصحاب ....

بھاگیرتھی "بس مردوں میں یہی عیب ہے جس کی تعریف کرتے ہیں اُسے آسمان پر چڑھا دیتے ہیں، اور یہ تعریف صرف اِس لئے ہے کہ لکھنے والی عورت ہے۔ ورنہ کسی مرد کے لئے یہ الفاظ کبھی استعمال نہ ہوتے"۔

ایشور سرن "یہ تو بالکل ٹھیک ہے"۔

بھاگیرتھی "نظم بُری نہیں، مَیں پہلے ہی تعریف کر چکی ہوں، مگر ذرا اپنی

نظم تو دیکھو، گنگا کے گھاٹ پر! اُس کے مقابلے میں اس کی حقیقت ہی کیا ہے۔ بارہ اور بارہ چوبیس سال لکھتی رہے جب بھی وہ بات پیدا نہ ہو، (منہ بنا کر) اگر صبح کے وقت سورج کی پہلی شعاع دیکھ کر ایڈیٹر سامنے آجائے تو منہ پر تھپڑ مار دوں۔ تم ایسے کم سمجھ ایڈیٹروں کے پاس اپنی نظمیں بھیجتے ہی کیوں ہو۔ خط آئیں تو چپ رہا کرو، پہلے تقاضے کر کر کے نظم لے لیتے ہیں پھر اس طرح توہین کرتے ہیں۔ مضمون نگار کو دیکھتے ہیں مضمون کو نہیں دیکھتے"

ایشور بھرن (ہنس کر) ارے! یہ تو چنڈ کا دیوی بن گئیں"

بھاگیرتھی "تم ہنستے ہو مجھے ایسی باتوں سے آگ لگ جاتی ہے، اب حیا بڑی شاعرہ بن گئی ہے"

ایشور بھرن "تو بھاگیرتھی! تم کیوں نہیں کہتیں، تم لکھو تو تمہاری بھی لوگ اسی طرح تعریف کریں ——— اور ہم پڑھ پڑھ کر کہیں واہ بیوی!

بھاگیرتھی "نا بابا مجھے ایسی تعریف کی ضرورت نہیں"

ایشور بھرن "مگر یہاں اب تمہیں انکار کرنے ہی کون دے گا، تمہیں اب لکھنا پڑے گا"

بھاگیرتھی "لیکن لکھنا آتا ہو جب نا"

ایشوریسرن۔ "آتا کیوں نہیں، جب مجھے خط لکھتی ہو تو اُس میں کیسا زور، کیسی رنگینی، کیسی موہنی ہوتی ہے، پڑھ کر دل کا کنول شگفتہ ہو جاتا ہے۔ بس اُنہیں جذبات کو نظم کر دو، پھر دیکھو کیا ہوتا ہے"۔

بھاگیرتھی۔ "یہ کام مردوں کا ہے عورتوں کا نہیں"۔

ایشوریسرن۔ "واہ عورتوں کا کیسے نہیں، بتاؤ حیا عورت ہے یا نہیں کیسا اچھا لکھتی ہے"۔

عورت کسی کی تعریف اُس وقت تک سُن سکتی ہے جب تک اُس کے خاوند سے مقابلہ نہ ہو۔ خاوند کے ساتھ مقابلہ ہونے پر اُس کی ساری خوبیاں مٹی میں مل جاتی ہیں، اس وقت وہ اس کی ذرا سی تعریف بھی برداشت نہیں کر سکتی۔

بھاگیرتھی نے کہا، "مَیں تو جانتی ہوں اُس کے خاوند نے لکھ کر اُس کے نام سے چھپوا دی ہوگی، تم چاہو تم بھی لکھ دو، منع کروں تو جو کالے چور کی سزا وہ میری"۔

ایشوریسرن۔ "مذاق چھوڑو! کہو لکھو گی یا نہیں"؟

بھاگیرتھی۔ "تم لکھ دو، مَیں نقل کر کے اپنے نام سے بھیج دوں گی"۔

ایشوریسرن۔ "یہ سبق مجھے اُستاد نے نہیں پڑھایا"۔

بھاگیرتھی "لوگ کہیں گے بھاگیرتھی دیوی برج کماری سے بھی بڑھ گئی"۔
ایشور سرن "خیالی پکاؤ پکا پکا کر خوش ہو لو"۔
بھاگیرتھی "ایڈیٹروں کی تعریف پڑھ کر لطف آجائے گا"۔
ایشور سرن "پہلے لکھ تو لو، پھر لطف بھی آجائے گا"۔
بھاگیرتھی "ارے، اپنے لئے اتنی نظمیں لکھتے ہو، کیا میرے لئے ایک بھی نہ لکھو گے؟ سوچتے ہوگے یہ بھی مشہور ہو گئی تو پھر مجھے کون پُوچھے گا؟"
ایشور سرن "مَیں تو چاہتا ہوں تم مجھ سے کئی درجہ اچھی نظمیں لکھو"۔
بھاگیرتھی "تم ہی لکھو گے، مَیں تو دستخط کر دوں گی"۔
ایشور سرن "کتنی آسانی سے شُہرت خریدنا چاہتی ہو؟"
بھاگیرتھی "مَیں اب تمہارا پیچھا نہ چھوڑوں گی، لکھوا کے رہوں گی"۔
ایشور سرن نے بھاگیرتھی کی طرف شکوہ آمیز نگاہوں سے دیکھا اور آہ سرد بھر کر چُپ ہو رہے۔

(۴)

اب بھاگیرتھی کے سر پر ایک ہی دُھن سوار تھی، ہر وقت ایشور سرن سے لڑا کرتی، تم کیسے مرد ہو۔ ایک نظم بھی نہیں لکھ دیتے، اپنے لئے نت نئی لکھتے ہو۔ میرے لئے ایک بھی نہیں لکھ سکتے۔ بڑا پیار

جتایا کرتے ہیں، جانور مجھ سے بڑھ کر اُنہیں کسی کا خیال ہی نہیں۔ لیکن ذرا سی بات کہی ہے وہ بھی نہیں مانتے۔ مَیں نظمیں کہنا جانتی تو گِن گِن کر آدھی نظمیں تمہارے نام سے چھپوا دیتی۔ ایشورسرن کہتے۔ بھاگیرتھی! تم کہیں پاگل تو نہیں ہو گئی ہو مجھ سے یہ کبھی نہ ہو گا۔ ناموری کی ہوس ہے تو محنت کرو۔ یہ کیا کہ دُکھ سہے بی فاختہ اور انڈے کوّا کھائے۔ دماغ سوزی مَیں کروں شہرت تم کماؤ۔ بھاگیرتھی یہ سُنتی اور رونے لگتی۔ ایشورسرن خاموش ہو جاتے، مگر منہ کی خاموشی سے دل خاموش نہ ہوتا۔ ایک وہ دن تھا جب وہ بھاگیرتھی سے تقاضا کرتے تھے اور بھاگیرتھی بچتی پھرتی تھی اب بھاگیرتھی تقاضے کرتی تھی اور ایشورسرن سٹ پٹاتے تھے۔ سوچتے تھے کیسی حماقت کی اسے یہ خیال نہ دلاتا تو آج ہاتھ کیوں ملتا! ایشورسرن نے جسے کمبل سمجھا تھا وہ ریچھ نکلا۔ اب وہ کمبل کو چھوڑتے تھے کمبل اُنہیں نہ چھوڑتا تھا۔ ایک طرف پُرش ہٹ تھی دُوسری طرف تِریا ہٹ تھا۔ کئی دن کی کشمکش کے بعد وہی ہُوا جو اس نیلگوں آسمان کے تلے ہوتا آیا ہے۔ مرد کا انکار عورت کی ضد کے سامنے پانی پانی ہو گیا۔ برف کا ٹکڑا کتنا ہی سخت کیوں نہ ہو، آفتاب کی نرم و گرم شعاعوں کے سامنے کب ٹھہرا ہے۔

ایک سال بعد بھاگیرتھی دُنیائے شاعری میں خاص وقار رکھتی تھی

اُن کی نظمیں دیکھ کر شاعر لوگ ایک دُوسرے سے پُوچھتے تھے یہ عورت کون ہے؟ چند ہی ماہ میں کہیں سے کہیں جا پہنچی۔ آج سے ایک سال قبل اس کا نام بھی کوئی نہ جانتا تھا آج چاروں طرف بھاگیرتھی کا غُلغلہ ہے۔ اُس کی نظموں کے لئے لوگ چشم براہ رہتے تھے۔ جس پرچے میں اُس کا ایک بند بھی شائع ہو جاتا۔ اُس کی مانگ بڑھ جاتی تعلیم نسواں کے حامی کہتے، دیکھا ایک عورت نے سارے مردوں کے دانت کھٹے کر دیئے۔ کیا اب بھی وہی دقیانوسی تان لگائے جاؤ گے کہ فطرت نے عورت کو محض گھر کے آنگن کے لئے مخصوص کیا ہے۔ مخالفین جواب دیتے پیچ بوچ تو اِن نظموں میں دھرا ہی کیا ہے۔ ایسی نظمیں مرد ہر روز لکھتے رہتے ہیں کوئی پرواہ نہیں کرتا۔ عورت کا نام اِن کی سب سے بڑی خُوبی ہے، اسی عورت کی نظم لے کر اُس کے نیچے کسی مرد کا نام لکھ دو پھر دیکھو کیا ہوتا ہے، کوئی پرواہی نہ کرے۔ اور جناب ہمارا تو یہ بھی خیال ہے کہ یہ کسی بگڑے دل مرد ہی کے کارنامے ہیں، ورنہ عورتوں کو چولہے توے سے فرصت ہی کب ملتی ہے؟

اُدھر بھاگیرتھی کے پاؤں زمین پر نہ پڑتے تھے، جس اخبار کو ہاتھ میں لیتی اُسی میں اپنی تعریف پاتی۔ اُس وقت اُسے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی نے تخت پر بٹھا دیا ہو۔ ایشور سرن کو اب وہ پہلے سے بھی زیادہ

چاہتی تھی۔ بات بات میں خوشامدیں کرتی اور مناتی۔ ایشور سرن بیجا غصّہ کرتے جب بھی چپ چاپ برداشت کر لیتی۔ دودھ دینے والی گائے کی لاتیں بھی سہنا پڑتی ہیں۔ لیکن ایشور سرن اُس سے خفا نہ ہوتے تھے۔ اخبارات و رسائل میں اپنی بھاگیرتھی کی تعریف پڑھتے تو پھولے نہ سماتے۔ ہم اپنی تعریف سُن کر اِس قدر خوش نہیں ہوتے جس قدر اپنی بیوی کی تعریف سُن کر ہوتے ہیں، اغیار کے مُنہ سے اپنی بیوی کی قابلیّت کا تذکرہ سُن کر، ہم پر جذبے کا عالم طاری ہو جاتا ہے۔ ہم اپنے آپ کو بھول جاتے ہیں، ہمارا دل کسی درخشاں دُنیا میں پہنچ جاتا ہے۔ لیکن کبھی کبھی بھاگیرتھی کسی نامعلوم خوف سے کانپ اُٹھتی تھی۔ اُسے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ مَیں آسمان کی لامحدود بلندیوں سے گرنے والی ہوں، میرا راز فاش ہونے والا ہے۔ تنہائی میں بیٹھتی تو سوچتی، کوّے نے مور کے پر لگا رکھے ہیں لیکن تا بکے، اِس وقت ناچتا ہے، خوش ہوتا ہے اور دوسرے پنچھی اُس کی طرف رشک کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ مگر اِس جھوٹے حُسن کی بقا کے گھڑیاں ہے۔ اِس فریب، اِس مکر کی عُمر کتنے دن ہے؟ لیکن اس کے باوجود وہ نظموں کے لئے شوہر سے برابر تقاضے کرتی رہتی تھی، اور لکھوا لیتی تھی جیسے شرابی شراب کو بُرا سمجھ کر بھی اُسے نہیں چھوڑ سکتا۔ شہرت کا نشہ شراب کے نشہ سے بھی تیز ہے ؎

مگر بھاگیرتھی کون ہے، یہ منشی ایشور سرن کے سوا کسی کو بھی معلوم نہ تھا۔ اُس کی نظمیں پڑھنے والے ہزاروں تھے، اُسے جاننے والا کوئی بھی نہ تھا۔ یہاں تک کہ اخبارات کے ایڈیٹروں کو بھی کچھ علم نہ تھا۔ اُنہیں نظمیں مل جاتی تھیں اور وہ شائع کر دیتے تھے۔ پر شہرت زیادہ دیر پردے میں نہیں رہتی، جس طرح پنچھی کا بچہ پنکھ نکلنے پر گھونسلے میں نہیں ٹھہرتا شُہرت کے بھی پنکھ ہوتے ہیں، آخر یہ راز کُھل گیا کہ بھاگیرتھی منشی ایشور سرن کی بیوی ہے۔ اخبارات کو نیا مضمون مل گیا۔ منشی ایشور کو اِس خوش نصیبی پر مُبارکبادیں ملنے لگیں لیکن وہ دل ہی دل میں کانپ رہے تھے، ایک راز کُھل گیا دُوسرا بھی کُھل جائیگا؟

(۵)

اُسی زمانہ میں منشی ایشور سرن کو شوگر مل کے کسی کام سے پنجاب کی طرف جانا پڑا، بھاگیرتھی اُداس ہوگئی، اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ محبّت جُدائی سے بہت گھبراتی ہے۔ جُدائی کو سامنے دیکھ کر اُس کا خُون خشک ہو جاتا ہے۔ بھاگیرتھی سوچنے لگی، اکیلی کیسے رہوں گی، یہ ہجر کے دن کیونکر کٹیں گے؟ منشی جی کا دفتر سے آنے کا وقت ہوتا۔ تو دروازے پر جاکر کھڑی ہو جاتی تھی، اب کیا کروں گی؟ لیکن مُلازمت کا سوال تھا، بغیر گئے چارہ نہ تھا، منشی صاحب نے کہا

چند ہی دن کی بات ہے، مَیں بہت جلد لَوٹ آؤنگا"

بھاگیرتھی بولی،" ایک عہد کرو، جب جانے دونگی"

الیشور سرن :- کیا؟

بھاگیرتھی :- "یہ کہ ہر جگہ سے چٹھی لکھیں گا اور ہر روز لکھوں گا اُداس دِل انتظار میں بہلتا رہے گا، اور نہ سہی روز کا آسرا تو ہو جائیگا"

الیشور سرن :- "بڑی بیڈھب شرط ہے، لیکن خیر منظور! کچھ اور؟

بھاگیرتھی :- "ہندو کنیا پاٹ شالہ کا جلسہ تقسیم انعامات قریب ہے اُس روز مسز لال بہاری لال آئی تھیں، کہتی تھیں اس موقع پر تمہارے ہاتھ سے انعام تقسیم ہو گا، مَیں نے بہت انکار کیا کہ مَیں اس قابل نہیں ہوں لیکن وہ نہ مانیں۔ مجبوراً ہاں کہنا پڑا، اب وہاں کوئی نظم پڑھنی ہو گی الیشور سرن کے چہرے پر سُرخی دوڑ گئی۔ مُسکرا کر بولے،" تو اب پردھان بنو گی؟ تم نے مجھ سے پہلے کیوں نہ ذکر کیا"؟

بھاگیرتھی :- "کیا کروں، میرا دل تو گھبرا رہا ہے، مسز لال بہاری لال ایک نہیں سُنتیں"

الیشور سرن :- "مگر دل میں خوش ہو رہی ہو گی"

بھاگیرتھی :۔ مَیں جھوٹ نہیں بولتی ۔ گنگا جی کی قسم! میرا دل کانپ رہا ہے ۔ وہاں اتنے مجمع میں زبان بھی نہ کھلے گی، مرد ہونگے، کیسے بولوں گی؟"

ایشور سرن :۔ دستخط کر لینا کتنا آسان تھا ؟ کیوں" ؟

بھاگیرتھی :۔ اب بھگوان ہی ہے جو لاج رہ جائے، مردوں سے ڈر لگتا ہے"۔

ایشور سرن :۔ خوب رہے گی، اب تو عورتیں مردوں میں لکچر دینے لگیں تم نظم بھی نہ پڑھ سکو گی کیا۔ دیکھو بھاگیرتھی! مردوں اور عورتوں میں کتنا فرق ہے ۔ ہم کئی سال سے نظمیں کہہ رہے ہیں، کسی نے تمغہ بھی نہ دیا، تمہاری چار نظمیں اخبارات میں شائع ہوئیں تم جلسوں میں پردھان بننے لگیں"۔

بھاگیرتھی نے محبت کی نگاہوں سے شوہر کی طرف دیکھا اور کہا "سچ کہتے ہو، یہ اعزاز تمہارا ہے یا میرا؟"

ایشور سرن :۔ تمہارا ہی ہے میرا کاہے کو ہے، مَیں تو چاہتا ہوں پرماتما آئندہ جنم میں مجھے بھی عورت ہی بنائے، لوگ تعریف تو کریں گے فرمائیے اب مجھے کیا حکم ہے؟"

بھاگیرتھی :۔ چلو مَیں تم سے نہ بولوں گی"۔

الیشور سرن :- اچھا غلطی ہوئی، معاف کر دو"۔

بھاگیرتھی :- کوئی عمدہ سی نظم بھیج دینا، اور ذرا جلدی، کہیں ایسا نہ ہو تُم بھُول جاؤ، اور یہاں بنا بنایا کھیل ہی بگڑ جائے۔ رومال میں گرہ دے لو"۔

الیشور سرن :- رومال میں گرہ دینے کی کیا ضرورت ہے۔ یہاں دل پر نوٹ ہو گیا"۔

اس کے بعد الیشور سرن نے بھاگیرتھی کو گلے لگا لیا، اور باہر نکل آئے بھاگیرتھی دروازہ پکڑ کر کھڑی ہو گئی، اور اشک آلود نگاہوں سے شوہر کی طرف دیکھتی رہی۔

چند دن کے بعد نظم آ گئی "قوم کی بیٹیوں سے خطاب" اسے پڑھ کر بھاگیرتھی خوشی سے اُچھل پڑی۔ یہ نظم معمولی نظم نہ تھی، اس میں جذبات تھے، اس میں جذبات کی رُوح تھی، اس میں تخیل تھی، اس میں زور تھا بھاگیرتھی کو یقین ہو گیا، کہ تقسیم انعامات کے دن میرا رُعب ہر دل پر طاری ہو جائیگا۔ اور جب یہ نظم کہیں شائع ہو گی، تو شور مچ جائیگا۔ میرے نام سے نظمیں بہت شائع ہوئی ہیں، لیکن ایسی پُر کیف۔ ایسی سحر آگیں، ایسی دل و دماغ کو وجد میں لے آنے والی نظم آج تک شائع نہیں ہوئی۔ یہ نظم نہیں رُوحِ نظم ہے۔ اس وقت اُسے شوہر کی رُوحانیت کا پُورا

پُورا احساس ہُوا، پتہ نہیں کتنی محنت سے لکھی ہو گی۔ اِس کے لئے کس قدر دماغ سوزی کی گئی ہو گی۔ اِس خود غرض سفلی دُنیا میں ایسی چیزیں کون کسی کو دے دیتا ہے، لیکن محبّت ایثار کی ماں ہے، جہاں جاتی ہے بیٹی کو ساتھ لے جاتی ہے۔ بھاگیرتھی نے دل ہی دل میں اپنے عالی حوصلہ شوہر کو پرنام کیا اور نظم کو سینے سے لگا لیا۔

جلسہ کے دن ہال میں تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ فرش، گیلری، پلیٹ فارم سب بھرے ہوئے تھے۔ اس سے بیشتر جلسوں میں مرد کم تعداد میں شریک ہوتے تھے لیکن اس سال مرد عورتوں سے بھی زیادہ تھے۔ اور اگر عورتوں کا اُٹھانا ممکن ہوتا تو جو عورتیں بیٹھی تھیں مرد اُن کو بھی اُٹھا دیتے۔ لیکن سب لوگ بھاگیرتھی کی نظم سُننے آئے تھے، یہ غلط ہے۔ قریباً نصف سے بھی زیادہ تعداد ایسے مردوں کی تھی جو محض بھاگیرتھی کو دیکھنے آ گئے تھے۔ کہ چلو دیکھیں تو سہی کیسی عورت ہے جو نظمیں لکھتی ہے۔

(۶)

آخر ایک طرف سے شور اُٹھا، لوگ اِدھر اُدھر دیکھنے لگے جو پیچھے بیٹھے تھے وہ کھڑے ہو گئے، جو کھڑے تھے وہ آگے کھسکنے لگے۔ ارکانِ جلسہ نے چلّا چلّا کر کہا "بیٹھ جائیے"! لیکن نقار خانے میں طوطی کی صدا

کون سنتا ہے؟ اس کا چنداں اثر نہ ہوا۔ جلسہ گاہ میں بدنظمی پھیل گئی کوئی کہتا تھا بھاگیرتھی دیوی آگئیں، کوئی کہتا تھا ہجوم کا ریلا ہے۔ باہر بازار تک آدمی ہی آدمی کھڑے ہیں، جگہ کم ہے، آدمی بہت ہیں، ان کو وسیع جگہ کا انتظام کرنا چاہیئے تھا۔ ایک بنچ پر بہت سے آدمی چڑھ گئے، وہ ٹوٹ گئی، عورتوں کی صف میں کئی بچّے رونے لگے۔

یکایک ہال میں سنّاٹا چھا گیا، لوگوں نے دیکھا مسز لال بہاری لال کے ساتھ ایک نوجوان لڑکی کشمیری ساری پہنے آرہی ہے، اُس کا سر جُھکا ہوا تھا، وہ نہایت احتیاط کے ساتھ بچا بچا کر پاؤں دھرتی تھی اُس کے چہرے پر انکسار تھا، لیکن یہ انکسار غرور سے بھی زیادہ متکبّر تھا لوگوں نے پُرجوش تالیوں سے ہال سر پر اُٹھا لیا، یہی بھاگیرتھی دیوی تھیں، وہی عورت جس کا نام سب کی زبان پر تھا۔

باقاعدہ تجویز اور تائید کے بعد بھاگیرتھی دیوی کرسی صدارت پر آکر بیٹھیں اور انعام تقسیم کرنے لگیں۔ اِس موقع پر اُس کے قلب کی جو حالت تھی اُسے وہی جان سکتا ہے جسے خود کبھی یہ اعزاز نصیب ہوا ہو۔ عوام اسے محسوس نہیں کر سکتے۔ خدا خدا کر کے یہ وقت جو پاٹ شالہ کی انعام لینے والی لڑکیوں اور اُن کے والدین کے سوا اور کسی کو بھی مرغوب نہ تھا ختم ہوا اور بھاگیرتھی دیوی تقریر کرنے کے لئے کھڑی

ہوئی، اب اُس کے چہرے پر وہ گھبراہٹ نہ تھی، اُس نے چاروں طرف دیکھا، اور تب وہ کہنا شروع کیا جو ایسے موقع پر ہر ایک آدمی کہتا ہے آپ نے مجھے جو اعزاز بخشا ہے، مَیں اس کی اہل نہ تھی۔ اِسی کانپور میں مجھ سے قابل عورتیں موجود ہیں جن کے سر کے بال عورتوں کی خدمت کرتے کرتے سفید ہوگئے۔ مَیں آپ کا شکریہ کس زبان سے ادا کروں جو آپ نے خاک کی چٹکی کو سر پر چڑھا لیا۔ وغیرہ وغیرہ۔

لوگوں نے چلّا کر کہا "نظم"۔

"میرے خیال میں یہ وقت نظم کے لئے موزوں نہیں"۔

لوگ بولے "بہت موزوں ہے، ہم دیوی جی کی نظم سُن کر جائیں گے"۔

اب بھاگیرتھی نے نظم نکالی۔ لوگ سنبھل کر بیٹھ گئے۔ بھاگیرتھی نے پڑھنا شروع کیا، مجمع پر جادو ہو گیا۔ ایک ایک مصرع پر واہ واکے فلک شگاف نعرے بلند ہونے لگے، جو نہ سمجھتے تھے وہ بھی جھومتے تھے، مبادا لوگ اُنہیں نالائق تصور کریں۔ بھاگیرتھی کے دل میں جو وہمی اندیشے تھے، سب بے بنیاد ثابت ہوئے۔ ایسی شاندار کامیابی کی اُسے خواب میں بھی اُمید نہ تھی۔ وہ اپنی نظم کو اور بھی جوش، اور بھی سرگرمی سے پڑھنے لگی۔ ہم جوں جوں کامیاب ہوتے جاتے ہیں ہماری سرگرمیاں بڑھتی جاتی ہیں۔

اتنے میں بھاگیرتھی کی نگاہ مسز بہاری لال کی طرف گئی، جو ایک کاغذ کے ٹکڑے کو نہایت غور سے دیکھ رہی تھی۔ بھاگیرتھی کا خون خشک ہو گیا، جیسے پھولوں کے ڈھیر میں ناگ نظر آ جائے۔ یہ ایشور سرن کا خط تھا جو انہوں نے پٹیالہ سے نظم کے ہمراہ بھیجا تھا جس میں انہوں نے اپنی نظم کی تعریف کی تھی اور اسے بھاگیرتھی کے نذر کیا تھا بھاگیرتھی کو اس کاغذ کو الگ کرنے کا خیال نہ رہا۔ نظم پڑھنے کے جوش میں پن نکل گیا، اور کاغذ نیچے گر پڑا۔ اور اب یہ راز.....

بھاگیرتھی کا سر گھومنے لگا۔ اس نے نظم ختم کی اور پلیٹ فارم سے نیچے اتر آئی۔ مرد جوش سے تالیاں بجا رہے تھے۔ عورتیں اپنے ہی ایسی مگر "دوسری قسم" کی ایک عورت کے چہرے کی طرف رشک سے دیکھ رہی تھیں۔ اور بھاگیرتھی کا دل خوف، رنج اور ندامت سے دھڑک رہا تھا۔ جب لوگ منتشر ہو گئے تو وہ مسز لال بہاری لال کو گھسیٹ کر پاس کے کمرے میں لے گئی۔ اور آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی "میری لاج اب تمہارے ہی ہاتھ ہے خواہ رکھو خواہ مٹی میں ملا دو"۔

مسز لال بہاری لال نے بھاگیرتھی کو وہ چٹھی واپس کرتے ہوئے کہا "میری زبان سے اس کے متعلق ایک لفظ بھی نہ نکلے گا"۔

(۶)

اِس کے بعد بھاگیرتھی کی نظمیں اخبارات میں نکلنا بند ہو گئیں لیکن برج کماری حیا کی نظمیں اُسی طرح شائع ہوتی رہیں، بھاگیرتھی پڑھتی تھی اور آہِ سرد بھر کر رہ جاتی تھی۔ اب اُس کے دل میں جلن نہ تھی، جو نو آموز شاعر کے دل میں کسی دُوسرے شاعر کو دیکھ کر ہوتی ہے اُس کی جگہ تسکین نے لے لی تھی جو ہارے ہوئے جواری کی آخری دولت ہے۔ یہ تسکین پر قلنچ پنچھی کے مانند نہ اُڑتی ہے نہ اُڑ سکتی ہے وہ نیلے وسیع پرشکوہ آسمان کی بلندیوں میں اُڑتے ہوئے پرندوں کو دیکھتی ہے اور چُپ چاپ گردن جھکا لیتی ہے۔ یہ حالت کچھ دنوں قائم رہی۔ اس کے بعد بھاگیرتھی کو شعر و نغمہ کی چھوڑی ہوئی دُنیا کی یاد بھی بھول گئی۔ اب وہ وہی بھاگیرتھی تھی وہی اُس کے گھر کا آنگن تھا، وہی اُس کے روٹی پکانے کے، بھاجی بنانے کے روزانہ مشاغل تھے۔

ایک دن اُس سے ملنے کو ایک لڑکی آئی۔ اٹھارہ اُنیس سال کا سِن ہو گا، آنکھوں میں چمک تھی، چہرے پر تبسم، بھاگیرتھی نے سوچا کسی سکول میں پڑھتی ہو گی، محبت سے بولی "آؤ بہن اِدھر چلی آؤ"۔ لڑکی زینہ میں ٹھٹک کر کھڑی تھی۔ بھاگیرتھی کی بات سُن کر سے

بھی بولنے کی جُرأت ہوئی۔ آہستہ سے بولی "مجھے بھاگیرتھی دیوی سے ملنا ہے، لکھنؤ سے آئی ہوں"۔

بھاگیرتھی "تو اُوپر چلی آؤ بہن! مَیں ہی بھاگیرتھی ہوں"۔

لڑکی ایک پاؤں اُٹھا کر پھر رُک گئی۔ پہلی مرتبہ کسی کے گھر جا کر ہمارے پاؤں بے تکلّفی سے نہیں اُٹھتے، نہ مُنہ سے بات نکلتی ہے۔ لڑکی نے کہا "مَیں برج کماری حیا ہوں، درشن کرنے آئی ہوں"۔

اور دُوسرے لمحہ میں بھاگیرتھی نے برج کماری کو اپنے آغوش میں لے لیا جیسے دو بچھڑی ہوئی بہنیں ملی ہوں۔ اس کے بعد بھاگیرتھی اُسے بڑی محبّت سے کمرہ میں لے گئی۔ اور چارپائی پر بٹھا کر اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگی۔ جب گھر بار کا تعارف ہو چکا تو بھاگیرتھی نے کہا۔

"بہن! تمہاری نظمیں مجھے بے حد پسند ہیں، اُنہیں پڑھ کر مَیں کسی دُوسری دُنیا میں پہنچ جاتی ہوں۔ مرد سمجھتے تھے تحریر کا میدان ہمارے ہی لئے وقف ہے، تم نے اُن کا خیال بدل دیا، تم مبارک ہو تم نے نسوانی دُنیا کا سر بلند کر دیا"۔

برج کماری "یہ آپ کی ذرہ نوازی ہے، ورنہ آپ کے رُوبرو میری حقیقت ہی کیا ہے۔ آپ کی نظمیں آج بھی یاد آتی ہیں تو طبیعت

شگفتہ ہو جاتی ہے، ذرا ہاتھ لانا، اُسے آنکھوں سے لگاتوں"۔

بھاگیرتھی (شرما کر) "مگر میں نے تو اب لکھنا ہی چھوڑ دیا"۔

برج کماری۔ "لیکن کیوں؟ یہی دریافت کرنے تو آئی ہوں"۔

بھاگیرتھی۔ "اب کیا بتاؤں"۔

برج کماری۔ "کہیں منشی جی نے منع تو نہیں کر دیا، شاید سوچتے ہوں پاربتی کے سامنے مہادیو کو کون پوچھنے لگا"۔

بھاگیرتھی۔ "وہ ایسے خود پرست نہیں، اُنہیں جو سرور میری نظمیں دیکھ کر حاصل ہوتا ہے وہ اپنی نظمیں دیکھ کر نہیں ہوتا"۔

برج کماری۔ "تو کیا والدین بُرا مانتے ہیں؟"

بھاگیرتھی۔ "بالکل نہیں، تمہارے لکھنؤ ہی میں تو رہتے ہیں، کسی دن جاکر ملو تو تمہیں سر آنکھوں پر بٹھالیں، اُن کا تو خیال ہے کہ عورتوں کا علم و ادب سے پرے رکھنا ملک پر انتہا درجہ کا ظلم کرنا ہے"۔

برج کماری۔ "تو پھر اس پُر اسرار خاموشی کی وجہ کیا ہے؟"

بھاگیرتھی۔ چُپ ہو گئی، سوچتی تھی کیا کہوں کیا نہ کہوں، پہلے سوچا صاف صاف کہہ دوں، یہاں نظم کہنا جانتا ہی کون تھا وہ سب جھوٹ ہی جھوٹ تھا۔ وہ لکھتے تھے میں اپنے نام سے بھیج دیتی تھی چار دن چمڑے کے سکّے چل گئے، اب یہ مکر ہمیشہ کے لئے تھوڑا چل سکتا

ہے۔ مگر پھر خیال آیا اس کے دل میں میرے لئے کتنا احترام ہے، کتنی عقیدت سب پر پانی پھر جائیگا، اُسے تعجب ہوگا۔ وہ چونک اُٹھے گی کہے گی کیسی پست خیال عورت ہے، دُنیا کو خواہ مخواہ دھوکا دیتی رہی ہے۔ اِس وقت کیسی شان سے بیٹھی ہوں یہ کہہ کر سر جھک جائیگا۔ راست گفتاری کتنی مُشکل ہے؟ بھاگیرتھی نے برج کماری کی طرف دیکھا اور جواب دیا۔

"بہن! دُنیا کے دھندوں سے فُرصت ہی نہیں ملتی"۔

برج کماری :- "آپ کا یہ جواب نا تسلی بخش ہے مرد کیونکر وقت نکال لیتے ہیں، اتنا تو سوچئے"۔

بھاگیرتھی :- "اور اگر میں یہ کہہ دوں کہ شعر و شاعری سے جی اُکتا گیا تو......"

برج کماری :- "جی کیونکر اُکتا گیا، شاعری وہ چیز ہی نہیں جس سے کسی کا جی اُکتا جائے۔ ہرے بھرے جنگل، سر سبز و شاداب گھاٹیاں، چاند کی ٹھنڈی چاندنی، آبشار کے دلکش مناظر، عہدِ طفلی کے سنہرے ایّام، پرندوں کی نغمہ سنجیاں۔ ان میں سے کیا ایک بھی چیز ایسی ہے جس سے قدرت کے کسی پجاری کا جی اُکتا جائے۔ پھر کیسے ممکن ہے کہ کسی شاعر کا دل دُنیائے شاعری سے جہاں من کو موہ لینے والے یہ تمام رنگین مناظر چپّہ چپّہ پر

مَوجُود ہیں اُکتا جائے۔ نہیں، بہن ! یہ ناممکن ہے، یہ کبھی نہیں ہو سکتا، یہ کبھی نہیں ہوتا۔ یہ کبھی نہ ہونا چاہیئے۔ آپ مجُھ سے عہد کریں کہ اب آپ لکھا کریں گی، آپ کا نہ لکھنا ہندوستان کی عورتوں کا سب سے بڑا نُقصان ہے"۔

برج کماری بولتی جاتی تھی، اور بھاگیرتھی ٹکٹکی باندھ کر اس کے مُنہ کی طرف تک رہی تھی۔ بھاگیرتھی کو اب تک شُبہ تھا کہ یہ بھی کسی سے لکھوائی ہو گی۔ مگر اُس کی فصیح و بلیغ باتیں سُن کر اُس کی رائے تبدیل ہو گئی، یہ تصنع نہ تھا، اُس کے حسین دل کے پاکیزہ جذبات تھے۔ بھاگیرتھی کو یقین ہو گیا کہ یہ حقیقت میں شاعرہ ہے، اُس نے سر جُھکا کر کہا، "تم تو بات چیت میں بھی شاعری کرتی ہو۔ تم نے دو لفظ بولے مجُھ پر جادُو ہو گیا"۔

برج کماری "جب شروع کیا تھا تو ایک ایک لفظ کے لئے پریشان رہنا پڑتا تھا۔ اُس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ بیل منڈھے نہ چڑھے گی، مگر اب تو ذرا دقت نہیں ہوتی"۔

تھوڑی دیر بعد برج کماری نے پھر بھاگیرتھی سے عہد کرایا اور چلی گئی۔ مگر اُس کے لفظ بھاگیرتھی کے کانوں میں گونج رہے تھے۔ سوچتی تھی، اگر یہ لڑکی استقلال اور محنت کی بدولت اِس درجہ کو پہنچ

سکتی ہے تو کیا میں ہی گئی گزری ہوں۔ وہ تو کئی مرتبہ کہہ چکے ہیں کہ تم میں وہ چیز ہے، جو شاعری کا جوہر ہے۔ اگر کوشش کرو تو تمہارے لئے شاعر بننا ذرا بھی مشکل نہیں، لیکن میں نے غلط رستہ اختیار کیا۔ اور آج......

بھاگیرتھی کو اپنی عمر کا بھولا اور بھلایا ہوا زمانہ یاد آگیا۔ وہی نغمہ، وہی شیرینی، وہی جلوہ، وہی نہ فنا ہونے والا حُسن، نہ ختم ہونے والا شباب، نہ مُرجھانے والے گل و گلزار۔ وہ اُس دُنیا میں جانے کے لئے بیتاب ہو گئی۔ جیسے بچّہ کو میلہ کا منظر یاد آجائے۔ بھاگیرتھی بہت دیر تک بیٹھی سوچتی رہی۔ اس کے بعد اس نے ہمت مردانہ سے ہاتھوں کی مٹھیاں کس لیں اور بلند آواز سے کہا۔

"اب میں خود شاعر بنوں گی"۔

منشی صاحب ساتھ کے کمرہ میں تھے، یہ عہد سُن کر باہر آگئے، اور مسکرا کر بولے "آمین"۔

بھاگیرتھی نے شرما کر گردن جھکالی۔

دُو خُدا

(۱)

شام کا وقت تھا، ایک خُدا پرست فقیر بازار سے گزُر رہا تھا، دُکانوں کے چراغ جل چُکے تھے اور اُن کی مصنوعی روشنی میں دُنیا کے فانی چہرے اِس طرح چمک رہے تھے جس طرح عہد شباب میں چندروزہ حُسن چمکتا ہے۔

معاً ایک بالاخانہ سے کسی عیّاش امیر کی پری چہرہ محبُوبہ نے اپنا سر باہر نکالا اور فقیر کے جُبّہ پہ پان کی پیک تھُوک دی۔

(۲)

فقیر نے اُوپر دیکھا، اور یہ دیکھ کر کہ عورت اپنی غلطی پر نادم ہونے کے بجائے ابھی تک مُسکرا رہی ہے اُسے حیرت ہوئی۔ اور اُس نے مجذوبانہ انداز سے چلّا کر کہا "اے فانی انسان! خُدا کے بندوں کی یُوں تحقیر نہ کر، اُس کی نگاہوں میں تیرا حُسن اور تیرا شباب دونوں بے حقیقت ہیں۔"

مغرور حسینہ کا سُرخ چہرہ اور بھی سُرخ ہو گیا، اور اُس نے عالم

آزردہ گئی ہیں پیچھے مُڑ کر اپنے عاشق سے کہا، "تم نے دیکھا، ایک ناچیز گداگر بھرے بازار میں میرے حُسن و شباب کی تحقیر کر رہا ہے"۔

اور عیّاش امیر جو عورت کے فانی رنگ و روغن کے نشہ میں دین و دُنیا سے اندھا ہو رہا تھا، لاٹھی لے کر تیزی سے نیچے اُترا اور خدا پرست فقیر پر پل پڑا، اور اُس نے اپنے ہاتھوں، پاؤں اور لاٹھی کی پُوری قوت سے اُسے اُس کی "زبان درازی" کے لئے زد و کوب کیا۔

فقیر کی چیخیں آسمان میں گونج رہی تھیں، لیکن زمین والوں کے کان اُس کی طرف سے بالکل بند تھے۔

(۳)

رات کو قُدرت کا غیبی ہاتھ حرکت میں آیا اور دُوسری صُبح کم نگاہ امیر اپنے گُناہ آلُود بستر پر بیجان پڑا تھا۔ اس عورت نے دل کی آہ کا یہ جیتا جاگتا معجزہ دیکھا، اور اُس کا خُون اس کی رگوں میں سرد ہو گیا۔ وہ برہنہ سر برہنہ پاؤں شہر کے باہر گئی اور فقیر کے کھُردرے پاؤں پر اپنا نازنین سر رکھ کر رونے لگی۔

فقیر نے اُسے دیکھا اور کہا "مائی اُٹھ! میرا خُدا اپنے کسی بندے کو ایسی بے بسی کی حالت میں نہیں دیکھنا چاہتا"۔

لیکن عورت نے پاؤں نہ چھوڑے۔ جس طرح بچّہ ڈر کے وقت ماں کی گود نہیں چھوڑتا۔

وہ اب اپنے فعل بد پر نادم تھی اور پریشان تھی اور رو رہی تھی اور اُس کے آنسو فقیر کے پاؤں پر گر رہے تھے۔ اُس نے شدتِ گریہ سے رُک رُک کر کہا "میں اندھی تھی، میں نے قصور کیا، میں نے گناہ کیا، مجھے گالیاں دیجئے، مجھے ماریئے، میری کھال اُدھیڑ دیجئے، لیکن اپنے غضب کی آگ سے بچا لیجئے"۔

فقیر نے اُس کے عاشق کے انجام کی خبر سُنی اور زار و قطار روتا ہُوا بولا

"مائی یہ میرا اور تیرا جھگڑا نہیں تھا، میرے خدا اور تیرے خدا (؟) کی جنگ تھی۔ تیرے خدا کو غصہ آیا، اُس نے مجھے مارا، میرے خدا کو غصہ آیا اُس نے تیرے خدا کو مارا۔ لیکن میرے خدا کے وار بھاری تھے وہ جیت گیا اور تیرا خدا (؟) اُس کے ذہن کمزور تھے حقیقت تھا وہ مارا گیا"۔

یہ کہتے کہتے فقیر یکایک ایک تیسرے آدمی کی طرف مڑا اور اپنے سر کو ایک عجیب انداز سے جنبش دے کر بولا "تیرا خدا کون ہے؟"

وہ آدمی اور وہ عورت دونوں اس سوال پر حیران تھے، وہ کوشش کرتے تھے کہ اس سوال کا مطلب سمجھیں مگر اُن کے فکر کی وہاں تک رسائی نہ تھی۔

فقیر اُٹھا اور ان کو اسی حالت میں چھوڑ کر اپنی جھونپڑی سے باہر نکل گیا۔

جب لاش نے شہادت دی

(۱)

یہ واقعہ اُس زمانہ کا ہے جب بنگال کے شُہرۂ آفاق ناول نویس بابو بنکم چندر چٹر جی بارا ست میں ڈپٹی مجسٹریٹ تھے۔

ساون کا مہینہ تھا، جل تھل ایک ہو رہا تھا، آسمان پر بادل اس طرح دوڑتے تھے جیسے زمین پر ندیاں بہ رہی ہوں، دن کے وقت بھی چاروں طرف تاریکی چھائی رہتی تھی۔ گڑھے۔ ندی، نالے سب میں پانی تھا۔ کہیں کہیں سڑک کے پُل بھی ٹوٹ گئے تھے اور پانی اُن کے اُوپر سے بہ رہا تھا جیسے فتحیاب سپہ سالار شکست خوردہ دُشمن کے علاقہ میں داخل ہو۔

شام ہوگئی تھی، رات کی تاریکی آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھی۔ ایسے وقت میں رحیم گنج کے ہرناتھ بھٹاچاریہ اس سڑک پر چل رہے تھے۔

جو بارا ست کو جاتی ہے۔ ان کو کیچڑ کا، پانی کا، گڑھوں میں گرنے کا خیال نہ تھا، خیال یہ تھا کہ جیسے بھی ہو رات ہونے سے پہلے پہلے بارا ست پہنچ جائیں۔ ان کا اکلوتا لڑکا کلکتہ میں ملازمت کرتا تھا۔ ہرناتھ کو اس سے بہت پیار تھا، آج کئی دن سے وہ وہاں بیمار پڑا تھا ہرناتھ کے دل پر بھالے چل رہے تھے۔ بادل ڈراتے تھے، پانی رستہ روکتا تھا سرد ہوا مخالفت پر کمر بستہ تھی۔ لیکن بوڑھا باپ محبّت پدری کے جوش میں قدرت کا مقابلہ کرنے جارہا تھا۔ ہمّت کا مقابلہ سب کوئی کرسکتا ہے مگر محبّت کا مقابلہ کرنے کی جرأت کسی میں نہیں۔ یہاں تک کہ آگ اور پانی بھی اس کے سامنے گردن جھکا دیتے ہیں *

ہرناتھ باراست پہنچ گئے، اب سوال یہ تھا کہ رات کہاں رہیں؟ کوئی رشتہ دار، کوئی دوست کوئی صورت آشنا نہ تھا۔ چاروں طرف دیکھتے تھے کہ شاید کوئی ہمدرد نظر آجائے، شاید کسی کے دل میں ایک پردیسی کے لئے جذبۂ رحم پیدا ہو جائے۔ انہوں نے کئی دکانداروں سے کہا "رات کاٹنے کے لئے تھوڑی جگہ دیدو، صبح اٹھ کر چلا جاؤنگا"۔ لیکن کسی نے جگہ نہ دی۔ کسی نے کہا مہاراج! معاف کرو، اپنے لئے جگہ نہیں آپ کو کہاں سلالیں، کسی نے کہا، برکھا کے دن ہیں چھت ٹپکتی ہے، کوئی بولا چور ڈاکو مسافر بن کر آتے ہیں اور لوٹ کرلے جاتے ہیں،

ہرناتھ مایوس ہو گئے۔ ان کا دل رونے لگا، پردیس میں اپنا دیس یاد آگیا۔ وہاں تو یہ حالت نہ تھی، ہر صُورت شناسا تھی، ہر صُورت دیکھی ہوئی تھی، سب اپنے تھے، بیگانہ ایک بھی نہ تھا، اُن میں سے کوئی اُن کا بھائی تھا، کوئی چچا، کوئی دوست، کوئی رشتہ دار، وہ ان میں سے ہر ایک سے اس طرح ملتے تھے جیسے سب کے سب ایک ہی گھر کے آدمی ہوں مگر یہاں اس غریب الوطنی میں یہ حالت نہ تھی۔ ان کے چاروں طرف آدمی تھے مگر کسی کے چہرے پر محبّت نہ تھی، نہ کسی کی آنکھوں میں مُروّت کا جذبہ تھا۔ نہ ادب نہ لحاظ۔ یہ پردیس تھا، جنم بھوم نہ تھا سب غیر تھے، اپنا کوئی بھی نہ تھا۔ ہرناتھ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے لیکن ان آنسوؤں کو دیکھنے والے کتنی دُور تھے؟ کتنے فاصلہ پر؟

آخر ایک برہمن کے دل میں پردیسی برہمن کے لئے درد پیدا ہُوا ہرناتھ کی باچھیں کھِل گئیں، جیسے کوئی کسان مقدّمہ جیت لے۔ برہمن اُنہیں گھر لے گیا اور ایک کمرے میں چارپائی ڈلوا دی۔ اب ہرناتھ نے اطمینان کی سانس لی۔ اور کہا "مہاراج! تم نہ ملتے تو مجھے بڑی تکلیف ہوتی، تم نے مجھ پر بڑا اکرم کیا جو جگہ دی ورنہ برکھا کی رات میں بیمار ہو جاتا"۔

میزبان نے کہا "یہ آپ مجھے شرمندہ کرتے ہیں، مَیں نے کوئی

احسان نہیں کیا، پردیسی کی سیوا کرنا تو ہر ہندو کا دھرم ہے۔ ہم لوگ سب کچھ بھول گئے، لیکن یہ وصف ابھی ہم میں باقی ہے۔ جو یہ بھی نہ کرے میں اُسے ہندو نہیں سمجھتا"۔

ہرناتھ کو زہر چڑھ گیا، آنسوؤں سے بھری ہوئی آنکھوں سے غصّہ کے شرارے نکلنے لگے۔ جیسے پانی میں آگ لگ جائے۔ تلملا کر بولے، "تو یقین کیجئے وہ ہندو اب مٹ چکے، اصل چلے گئے نقل باقی ہیں وہ مہمان نوازیاں، وہ محبّتیں وہ خلوص اب کہاں ہے، وہ سادگی وہ ایثار، وہ جوش اب کدھر چلا گیا؟ میں نے ایک ایک دکاندار سے گڑگڑا کر کہا۔ مجھے رات کاٹنے کو جگہ چاہیئے، مگر کسی نے پروانہ کی ہمارے شاستروں میں مہمان کو دیوتا کہا گیا ہے۔ اگر آج ان کے لکھنے والے آکر دیکھیں کہ مہمانوں سے کیسی ظالمانہ سرد مہری روا رکھی جاتی ہے تو وہ اپنا سر پیٹ لیں۔ ہندو وہی ہیں مگر رُوح وہ نہیں"۔

مالک مکان کا سر شرم سے جھک گیا لیکن اس نے حوصلہ مندی کے انداز سے کہا "اس کا ایک خاص سبب ہے"۔

"کیا؟"

"چند دن گزرے ایک پردیسی آیا تھا، رات کو رہا صُبح کو کئی سو کی چیز لے کر چلتا بنا۔ جب سے لوگ چوکنے ہو گئے ہیں، ورنہ اِس گاؤں کے

لوگ ایسے کبھی نہ تھے"۔

(۲)

ہرناتھ نے پُوجا پاٹھ ختم کیا، کھانا کھایا اور تب چارپائی پر لیٹ گئے لیکن نیند نہ آئی۔ پردیس کی پہلی رات اضطراب میں کٹتی ہے، کبھی گھر کا خیال آتا، کبھی لڑکے کا، کبھی اپنی بے بسی کا۔ یہاں تک کہ رات کے دو بج گئے اور اُن کو نیند نہ آئی۔ ہار کر وہ اُٹھ کر چارپائی پر ہی بیٹھ گئے اور مالا پھیرنے لگے۔

یکایک اُن کو ایسا معلوم ہُوا جیسے کوئی شخص آنگن میں آہستہ آہستہ چلا آرہا ہے۔ ہرناتھ چونک پڑے، جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے اُن کو یقین ہو گیا کہ یہ چور ہے، چوری کرنے آیا ہے۔ خیال آیا شور مچانا خلاف مصلحت ہے، چُپ چاپ لیٹا رہوں، گھبرا ہُوا چور وار کر بیٹھتا ہے بھگوان جانے کیسی پڑے کیسی نہ پڑے، مُفت میں پھنس گیا تو کوئی سیدھے مُنہ سے بات بھی نہ کرے گا۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی خیال آیا کہ یہ بُزدلی ہے اس برہمن نے مجھے رہنے کو جگہ دی ہے، اُس نے مجھ پر مہربانی کی ہے۔ کیسے شرم کی بات ہے کہ مَیں مُنہ دیکھتا رہوں اور چور چوری کر کے نکل جائے۔ یہ مہمان کا دھرم نہیں ہے۔

ہرناتھ دوڑ کر آنگن میں چلے گئے اور زور زور سے چلّانے لگے

"چور، چور"

برسات کا موسم تھا، رات کا وقت، تمام لوگ اپنے اپنے گھروں کے دروازے بند کر کے سو رہے تھے۔ چاروں طرف سنّاٹا تھا۔ یکایک ایک آواز سنّاٹے کو توڑتی ہوئی سُنائی دی۔

"چور، چور"

چور نے ایک صندوق اُٹھایا اور بھاگنے لگا، اُسے خیال تھا ہرناتھ میرے قریب نہ آئیگا، وہ چلّاتا ہی رہے گا اور مَیں نکل جاؤں گا لیکن ہرناتھ نے آگے بڑھ کر صندوق پکڑ لیا اور چلّانے لگے۔

"چور، چور"

چور نے چند لمحوں تک اپنی طرف سے پُورا زور مارا، لیکن ہرناتھ کی گرفت ڈھیلی نہ ہوئی۔ وہ خود بُڈھے تھے مگر اُن کے ہاتھ جوان تھے۔ چور گھبرا گیا۔ کیا کروں کیا نہ کروں، ہر لمحہ جو گزرتا تھا اُس کی گرفتاری کو یقینی بنا رہا تھا۔ یکایک اُسے ایک خیال سوجھ گیا۔ اُس نے صندوق کو مضبوطی سے پکڑ لیا اور ہرناتھ کے ساتھ ساتھ چلّانے لگا۔ "چور، چور"۔

ہرناتھ کے تعجّب کی انتہا نہ تھی۔ حیران تھے یہ کیا ہو گیا، چور چلّاتا کیوں ہے۔ لیکن ابھی ان کا تعجب رفع نہ ہُوا تھا کہ گھر کا مالک اور آس پاس کے لوگ چراغ لے کر باہر آ گئے۔ ہرناتھ کی آنکھیں کُھل گئیں، اُن کا دل

سہم گیا، چور پولیس کا آدمی تھا۔
گھر کا مالک کبھی ہرناتھ کی طرف دیکھتا تھا کبھی پولیس کے سپاہی کی طرف، وہ سمجھنا چاہتا تھا کہ صورتِ حال کیا ہے لیکن سمجھ نہ سکتا تھا تب اُس نے ہرناتھ سے مخاطب ہو کر پوچھا، "بات کیا ہے؟"

ہرناتھ نے جواب دیا "مہاراج! بات یہ ہے کہ میں . . . . .

رمضان علی نے قطع کلام کر کے کہا "چپ حرامزادے! سُور کے بچے! مُنہ کھولا تو زبان کھینچ لونگا" اس کے بعد لوگوں کو مخاطب کر کے بولا۔

"بھائی صاحب! بات یہ ہے کہ میں گشت کر رہا تھا، یہ دروازہ کھلا دیکھ کر مجھے شبہ ہوا، میں کھڑا ہو گیا دیکھتا کیا ہوں کہ آنحضرت یہ صندوق اُٹھائے بھاگنے کی تیاریوں میں ہیں۔ میں نے لپک کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا جاتے کہاں ہو، اب ذرا ٹھیر جاؤ۔ اس نے پہلے تو بڑی کوشش کی کہ کسی طرح نکل جائے لیکن جب دیکھا کہ بھاگنا ناممکن ہے تو مجھ سے کہنے لگا۔ بھیّا! چھوڑ دے، آدھا مال تیرا ہو گا لیکن یہاں ایسی نیّت ہی نہیں رکھی ہے"۔

یہ کہہ کر سپاہی نے ہرناتھ کے مُنہ پر ایسے زور سے طمانچہ مارا کہ ان کا مُنہ بھنّا گیا، اُنہوں نے بہتیرا کہا کہ یہ بکتا ہے، صندوق اسی نے نکالا تھا میں نہ پکڑتا تو تم لُٹ چکے تھے لیکن اُن کی کسی نے نہ سُنی۔ راستے میں

پولیس آگئی اور دونوں کو پکڑ کر تھانہ میں لے گئی۔ ہرناتھ کی آنکھیں زمین سے نہ اُٹھتی تھیں۔ چور پکڑنے چلے تھے خود گرفتار ہو گئے۔ دُنیا میں نیکی کرنا بھی کتنا مُشکل ہے ؛

(۳)

دُوسرے دن یہ مقدّمہ بنکم بابو کی عدالت میں پیش ہُوا، لوگوں کو ایک تماشہ ہاتھ لگ گیا۔ کہتے تھے دیکھیں کیا ہوتا ہے۔ کچہری کے پُرانے پُرانے لوگ بھی کہتے تھے، ایسا مقدّمہ ہم نے آج تک نہیں دیکھا۔ رمضان علی اپنے بیان پر اُسی طرح قائم تھا۔ وہ کہتا تھا، حضور! میں پولیس کا آدمی ٹھہرا۔ میں ایسا کام کیسے کر سکتا ہوں۔ زمانہ لاکھ بُرا ہے نیّتیں بدل گئی ہیں، دلوں میں فرق آگیا ہے۔ لیکن ماں ڈائن نہیں بن سکتی۔ چور یہی برہمن ہے، پردیسی بن کر آتے ہیں، لُوٹ کر اپنی راہ لیتے ہیں اور یہ اپنی قسم کا پہلا واقعہ نہیں ہے ایسی وارداتیں پہلے بھی ہو چکی ہیں ؛

ہرناتھ کہتے تھے، "تو جو چاہے کہہ لے، مگر بھگوان تو سب کچھ جانتے ہیں"؛

رمضان علی کی طرف مقامی پولیس کا سارا محکمہ تھا، صفائی کے گواہوں نے کہا ہم نے ایسا ایماندار آدمی تمام علاقہ میں نہیں دیکھا۔ پولیس میں رہ کر بھی پاک صاف بچا ہُوا ہے، یہ آدمی نہیں فرشتہ ہے۔ اِس پر چوری کا شُبہ کرنا اِس پر نہیں شرافت پر ظلم کرنا ہے ؛

رمضان علی کے وکیل صاحب نے بڑے جوش و خروش سے تقریر کی۔ یہ تقریر ایسی پُرزور اور مدلل تھی کہ ایک دفعہ تو رمضان علی کو بھی یقین ہو گیا کہ میں بے گناہ ہوں۔ سارا قصور اسی برہمن کا ہے۔ لیکن معصوم ہرناتھ کی طرف سے پیروی کرنے والا کوئی بھی نہ تھا۔ نہ کوئی آدمی ان کے حق میں ایک کلمۂ خیر کہنے کو تیار تھا۔ وہ عدالت میں سر نہ اُٹھا سکتے تھے۔ سوچتے تھے تمام لوگ مجھی کو مجرم سمجھ رہے ہیں، کوئی ثبوت بھی تو نہیں کیسے کہہ دوں یہ چور ہے، بُرے پھنسے، بھگوان ہی بچائے تو بچیں ورنہ کوئی رستہ نظر نہیں آتا۔

عدالت نے پُوچھا "برہمن دیوتا! تُم کہو کیا کہتے ہو؟"

ہرناتھ بولے "سرکار! یہ سپاہی نرا جھوٹ بولتا ہے، میں نے صندوق اس کے ہاتھ سے چھینا ہے"۔

"مگر ہمیں کیسے یقین آئے؟"

"سرکار میں قسم کھا سکتا ہوں"۔

"تمہارا کوئی گواہ بھی ہے"؟

"میں پردیسی ہوں، یہاں مجھے کون جانتا ہے، میرا گواہ خود بھگوان ہے"۔

"مگر بھگوان گواہی دینے تو نہ آئیگا"۔

"اگر میں بے قصور ہوں تو ضرور آئیگا"۔

"کوئی آدمی پیش کرو"۔

ہرناتھ نے چاروں طرف دیکھا اور عالم یاس میں کہا "سرکار! مجھے تو ان میں سے ایک بھی آدمی نظر نہیں آتا، کسی میں دیا دھرم کا نام نہیں، آدمی ہوتے تو ایک ہی نگاہ میں سمجھ لیتے کہ کون بے گناہ ہے کون گنہگار"۔

بنکم بابو نے ازراہِ ہمدردی کہا، "قانون بھی تمہارے لئے کچھ نہیں کر سکتا"۔

"اب سرکار! قانون کی کون کہے، قانون کے کان ہیں آنکھیں نہیں قانون صرف سُنتا ہے، اس میں دیکھنے کی طاقت نہیں۔ اگر دیکھنے کی طاقت ہوتی تو یہ انصاف کا تماشا کبھی کا ختم ہو چکا ہوتا"۔

رات کا وقت تھا، بنکم بابو اپنے مکان میں بیٹھے تھے اور کسی گہرے خیال میں غرق۔ اُن کو یقین ہو گیا تھا کہ برہمن بے قصور ہے ساری شرارت پولیس کے سپاہی کی ہے، لیکن اس کے لئے کوئی ثبوت نہ ملتا تھا۔ صداقت میں ایک خاص تاثیر ہوتی ہے وہ برہمن کی بات میں موجود تھی بے گناہی آنکھوں میں نظر آتی ہے، وہ برہمن کی آنکھوں میں نظر آتی تھی۔ لیکن قانون کی کوئی دفعہ، عدالتی کارروائی کا کوئی پہلو

ایسا نہ تھا جو برہمن کے حق میں جاتا۔ بنکم بابو کے سینہ پر کٹاریں چل رہی تھیں سوچتے تھے۔ کیا کریں کیا نہ کریں۔ کیا قانون سچ مچ اندھا ہے، کیا وہ صرف سُنتا ہی ہے دیکھتا نہیں۔۔ بنکم بابو کے سامنے اتھاہ تاریکی تھی، کوئی ہلکی سی کرن بھی دکھائی نہ دیتی تھی اِس پریشانی کے عالم میں بہت دیر سوچتے رہے، غور کرتے رہے لیکن کوئی رستہ نظر نہ آیا وہ گیش نندنی کا مصنّف، بندے ماترم کا لکھنے والا، بنگال کا بہترین اہل دماغ جس نے اپنی قابلیّت سے دُنیائے ادب میں شہرت کے ڈنکے بجا دیئے تھے آج ایک ذرا سی بات پر پریشان ہو رہا تھا۔ یہ عُقدہ کیسے حل ہو، یہ مُشکل کیسے آسان ہو۔ کوئی بھولا ہُوا مُسافر جنگل کی رات کے موقعہ پر بھی ایسا پریشان نہ ہوتا ہو گا۔ یکایک بنکم بابو کے دماغ میں ایک خیال آگیا، جیسے بادلوں میں بجلی کوند جائے۔ اس کے چہرے کی پریشانی رفع ہو گئی، آنکھیں چمکنے لگیں، اُنہوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ اور اِدھر اُدھر دیکھا لیکن کمرہ خالی تھا، چلم کی آگ بھی بُجھ چکی تھی، اُنہوں نے باوازِ بلند پُکارا "ہری"۔

ہری نے آہستہ سے کمرہ میں قدم رکھا اور کہا "کھانا لاؤں؟"

"نہیں! تُم اِس وقت برج لال بابو کے پاس جاؤ اور کہو بُلایا ہے گھر پر نہ ہونگے تو کلب میں ہونگے وہیں چلے جانا، کہنا بڑا ضروری کام

ہے، اِسی وقت آؤ"۔

یہ برج لال ہونہار جوان تھا، لکھنے پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ شہر کے نوجوانوں نے ایک ناٹک کلب بنا رکھی تھی برج لال اس کا رُوح رواں تھا۔ اس کے پارٹ کو لوگ بہت پسند کرتے تھے اور بنکم بابو تو اس پر فریفتہ تھے۔ اس کا پارٹ بناوٹ اور تصنع سے خالی تھا، سٹیج پر جا کر وہ پاگل نہ ہو جاتا تھا، وہاں بھی اُس کا حوصلہ، سنجیدگی اور سکون اسی طرح قائم رہتے تھے وہ سٹیج کو سٹیج نہ سمجھتا تھا دوستوں کی محفل سمجھتا تھا، یہی اُس کی کامیابی کا راز تھا۔

تھوڑی دیر بعد برج لال آ گیا اور بولا "آج بہت بے موقعہ یاد کیا ایک نئے تماشہ کی ری ہرسل ہو رہی تھی"۔

بنکم بابو نے ہنس کر کہا "کام ہی ایسا تھا ورنہ تمہیں تکلیف نہ دیتا، ہاں اُس دن نقلی نواب کے تماشہ میں تم کیا بنے تھے؟"

"سپہ سالار"۔

"اور زخمی ہو کر مر گئے تھے؟"

برج لال نے مُسکرا کر جواب دیا "جی ہاں! مگر پھر زندہ ہو گیا"۔

"تُمہارا وہ پارٹ لاثانی تھا، مَیں نے ایسا مُردہ آج تک نہیں دیکھا"۔

"یہ آپ کا حُسنِ ظن ہے"۔

"کل صبح مجھے ملنا، ایک نہایت ضروری کام ہے"۔

"بہت اچھا۔ مگر اس برہمن کے مقدّمہ کا فیصلہ ہو گیا یا نہیں"۔

"کل تاریخ ہے"۔

(۴)

دُوسرے دن پردیسی برہمن کے مقدّمہ کا فیصلہ ہونے والا تھا، عدالت میں لوگوں کا ہجوم تھا۔ لوگ سرگوشیاں کرتے تھے کہ دیکھیں کیا ہوتا ہے، اتنا ہجوم تھا کہ کہیں تِل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ بنکم بابو اجلاس میں بیٹھے تھے۔ سامنے دونوں مُلزم کھڑے تھے۔ اس وقت ان کے چہرے اُمید و بیم کا گہوارہ بنے ہوئے تھے۔ ہرناتھ بار بار آسمان کی طرف دیکھتے تھے، اور سرد آہیں بھرتے تھے۔

اِتنے میں ایک چپراسی ہجوم کو چیرتا ہُوا بنکم بابو کے پاس پہنچا اور ہانپ کر بولا "سرکار! برجو بابو کا خُون ہو گیا"۔

بنکم بابو۔ "ارے! یہ کہاں؟"

چپراسی۔ "حضور وشنو ہاٹ کی سڑک پر پُل کے نیچے لاش پڑی ہے۔ سارے جسم پر زخم لگے ہیں اور کپڑے تو خُون سے تر ہو رہے ہیں"۔

بنکم بابو۔ "کیسا ہنس مُکھ، ملنسار جوان تھا"۔

چپراسی۔ "حضور! اب موت کے آگے کس کی پیش جا سکتی ہے۔ پرماتما

جانے کس ظالم نے مارا ہے، لاش اُٹھا دی جائے نا"۔

بنکم بابو "سوچ کر" نہیں، تم اسے یہیں اُٹھوا لاؤ، ایک بار ہم دیکھیں گے"۔

چپراسی "حضور! اب اس میں کیا دھرا ہے، مری مٹی ہے"۔

بنکم بابو "کوئی پروا نہیں، تم جلدی اُٹھوا لاؤ"۔

چپراسی "حضور! آدمی کہاں ملیں گے، دیر ہو جائے گی"۔

بنکم بابو "یہ دونوں ملزم لے جاؤ، اُٹھا لائیں گے اور داروغہ جی کو اطلاع دیدو کہ کوئی وہاں پر نہ مار سکے"۔

چپراسی نے چوکیدار کی چارپائی اُٹھوائی اور لاش اُٹھانے چلا، ہرناتھ اور رمضان علی دونوں اپنے نصیبوں کو روتے تھے کہ کہاں پھنس گئے۔ مگر اب عذر کی صورت نہ تھی۔ چپراسی نے لاش کو چارپائی پر رکھا اور ایک کپڑا ڈال اور اُن دونوں سے کہا اُٹھا کر آہستہ آہستہ لے چلو۔

تھوڑی دور جا کر چپراسی ذرا آگے نکل گیا، دونوں ملزم اکیلے رہ گئے ہرناتھ سوچتے تھے کیا نیکی کا یہی صلہ ہے، آرام سے لیٹا رہتا تو یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔ لڑکا پردیس میں بیمار پڑا ہے میں پردیس میں مردے اُٹھا رہا ہوں، پرماتما جانے اُس کا کیا حال ہے اور میرا فیصلہ کیا ہوتا ہے، غالباً پھنس ہی جاؤں گا۔ ڈپٹی صاحب نے اُس دن صاف صاف کہہ دیا تھا کہ قانون گواہی مانگتا ہے اور تمہارا گواہ بھگوان ہے جو دیکھتا

سب کچھ ہے بولتا کچھ بھی نہیں۔ انہوں نے آہ سرد بھری اور رمضان کی
طرف دیکھ کر کہا:۔
"بھیا! مَیں نے تمہیں پکڑ کر اپنے آپ سے دُشمنی کی، اگر پتہ ہوتا نصیبوں
میں یہ بدا ہے تو چُپ چاپ پڑا رہتا"۔
رمضان علی نے چاروں طرف دیکھا کہ کوئی قریب تو نہیں ہے اور
پھر کہا "اب کہو، مجھے پکڑنے کا مزہ مِل گیا نا؟ ارے ہم پولیس کے آدمی
ہیں ہمارا بال بھی بیکا نہ ہوگا۔ دیکھ لینا صاف نکل جائیں گے"۔
ہرناتھ:۔ ارے! مَیں بھی تو یہی کہہ رہا ہوں کہ مجھ سے حماقت ہو گئی۔
اب بیٹھا رو رہا ہوں، اگر پہلے علم ہوتا کہ اس کا نتیجہ ایسا بُرا ہوگا
تو کیوں خواہ مخواہ اُٹھتا، مزے سے پڑا رہتا۔ بھگوان! تیرا ہی
آسرا ہے"۔
رمضان علی:۔ اب بھگوان کو جیل خانے میں جا کر بلانا، کچہری سے اُسے
بھی خوف آتا ہے"۔
ہرناتھ:۔ مگر بھیّا! ہم تم تو جانتے ہیں کہ چور کون ہے، دُنیا کا کیا ہے،
جو چاہے کہے"۔
رمضان علی:۔ مگر اُس وقت تو تیرے سر پر بھوت سوار تھا۔ اگر مجھے
چھوڑ دیتا، تو تُو بھی صاف بچ جاتا، تیرے خلاف ثبوت بھی کیا

تھا، مال تو میرے پاس تھا"۔

ابھی بات چیت کا سلسلہ یہیں تک پہنچنے پایا تھا کہ کچہری آ گئی۔ رمضان علی اور ہرناتھ دونوں چپ ہو گئے۔ چپراسی نے کہا اسی طرح اندر لے چلو۔

لاش کچہری کے کمرہ میں پہنچ گئی۔ ہجوم میں سناٹا چھا گیا، لوگ دم بخود کھڑے تھے، پردیسی برہمن کا مقدمہ سننے آئے تھے، یہاں خون کا مقدمہ پیش ہو گیا۔ ہجوم میں برج لال کے کچھ دوست بھی تھے، اُن کے چہروں پر رنج و غم کے آثار نمایاں تھے۔ کسے خیال ہو سکتا تھا کہ یہ شخص اتنی جلدی مر جائیگا۔ ابھی رات کو کلب میں ریہرسل کر رہا تھا اور اس وقت......

بنکم بابو کرسی پر بیٹھے تھے۔ کھڑے ہو گئے اور قلم سے اشارہ کر کے بولے "کپڑا ہٹا دو"۔

چپراسی نے لاش سے کپڑا اُٹھا دیا، اور اُس کے ساتھ ہی لاش چارپائی سے اُٹھ کر گواہوں کے کٹہرے میں کھڑی ہو گئی۔ عدالت میں شور مچ گیا۔ کچھ لوگ کمرے سے نکل کر باہر چلے گئے، چاروں طرف سے آواز آئی "بھوت بھوت"۔

مگر بنکم بابو نے ساحرانہ انداز سے لوگوں کو چپ رہنے کا اشارہ کیا، اور ہنس کر بولے۔ کہو برج لال بابو کیا سنا ہے؟"

برج لال نے کہا "حضور! برہمن بے گناہ ہے، ساری شرارت

رمضان علی کی ہے۔ مَیں نے سب کچھ اپنے کانوں سے سُنا ہے"۔

یہ کہہ کر اُس نے رمضان علی اور ہرناتھ کی تمام گفتگو عدالت میں سُنادی۔

اب لوگوں کو معلوم ہُوا کہ یہ خُون کی واردات علیحدہ ناٹک نہ تھا۔ اسی چوری کے مقدّمہ کا ایک شاخسانہ تھا۔ وہ اِس دانائی پر عش عش کرنے لگے۔ کیا عجیب مقدّمہ تھا، اور کیا عجیب فیصلہ، کسی کو شُبہ بھی نہ ہوسکتا تھا کہ بنکم بابو انصاف کا راستہ صاف کرنے کے لئے ایسا طریقہ اختیار کریں گے۔ یہ آج کل کا انصاف نہ تھا پُرانے زمانے کا انصاف تھا، آج ایسے فیصلے دیکھنے میں نہیں آتے۔

بنکم بابو نے ہنس کر کہا "برہمن دیوتا! آخر قانون کے کانوں نے سچّی بات سُن ہی لی"۔

ہرناتھ "نہیں سرکار! بھگوان اپنے بھگت کو سنکٹ میں دیکھ کر خود ہی گواہی دینے آ گئے، نہیں تو میرے پھنسنے میں کسر نہ تھی"۔

تھوڑی دیر بعد بنکم بابو نے فیصلہ سُنا دیا۔ رمضان علی کو دو سال قید بامشقت، ہرناتھ بھٹاچاریہ بری۔

(جزواً ماخوذ)

شُعلۂ مضطر

(۱)

والنٹیر نے کہا "وہ تو ہمارے ماسٹر صاحب ہیں!"

مَیں چونک پڑا، مجھے کبھی خیال بھی نہ تھا کہ وہ ماسٹر ہو سکتا ہے۔ مَیں سمجھتا تھا کوئی نوکر ہو گا۔ شاید کسی وکیل کا چپراسی ہو۔ اس سے زیادہ میں نے اسے کبھی نہیں خیال کیا۔ کس قدر حیرت کی بات ہے کہ جو شخص رات کے بارہ بارہ بجے تک ہماری خدمت کرتا رہا تھا، جسے جُوتے صاف کرنے، میلے کپڑے دھونے اور دیگر ذلیل سے ذلیل کام کرنے سے بھی عار نہ تھا وہ سکول کا ماسٹر نکلا، مجھے اپنی قوّت قیافہ شناسی پر بہت ناز ہے۔ مَیں سمجھتا ہوں مَیں آدمی کا چہرہ دیکھ کر اُس کی دلی کیفیت بھانپ جاتا ہوں۔ لیکن کم از کم ملتان کی اس کم گو، غریب پُر اسرار شخصیت کے سامنے میری قوّت بالکل بیکار ثابت ہوئی۔ تاہم مجھے ابھی تک شُبہ تھا کہ

ممکن ہے والنٹیر کسی دُوسرے آدمی کا ذکر کر رہا ہو۔
مَیں نے کہا "تم کس شخص کی بابت کہہ رہے ہو۔ میرا اشارہ اُس آدمی کی طرف ہے جو رات کو ہمیں دُودھ دینے آیا تھا"۔
والنٹیر:- "جی ہاں! مَیں بھی انہی کی بابت کہہ رہا ہوں"۔
مَیں:- "تم رات کے لیکچر میں تھے؟ ہاں تھے، لیکچر شروع ہونے پر جس شخص نے میز پر بجلی کا لیمپ رکھا تھا، مَیں اُس شخص کا ذکر کر رہا ہوں"۔
والنٹیر:- "وہی ماسٹر صاحب ہیں"۔
مَیں:- "یقیناً تُم غلطی کر رہے ہو، میری آنکھیں ایسی غلطی کبھی نہیں کر سکتیں کہ ایک معمولی نوکر اور سکول ماسٹر میں تمیز نہ کر سکیں، (تھوڑی دیر سوچنے کے بعد) اچھا ان کا نام کیا ہے؟"
والنٹیر:- "لالہ آتما رام بی۔ اے۔ بی۔ ٹی۔ ہمارے سکول میں سیکنڈ ماسٹر ہیں"۔
مَیں:- "مگر شکل و صُورت سے تو معلوم نہیں ہوتا، کہ وہ گریجوایٹ ہونگے اگر وہ مجھ سے کہتے کہ مَیں گریجوایٹ ہوں۔ مَیں جب بھی نہ مانتا سمجھتا جھوٹ بول رہے ہیں۔ اور مجھے تو ابھی تک یقین نہیں آتا"۔
والنٹیر:- "آپ ہی پر کیا منحصر ہے، انہیں دیکھ کر کوئی شخص بھی باور

نہیں کرتا کہ یہ گر بجوایٹ ہیں"۔

مَیں:۔ "کپڑے کیسے معمولی پہنتے ہیں؟ جیسے قُلی ہوں، بلکہ میرا خیال ہے قُلیوں کے کپڑے بھی ان سے بہتر ہوتے ہیں"۔

والنٹیر:۔ "گھر میں اِس سے بھی بُرے پہنتے ہیں۔ البتہ جب انسپکٹر آنے والا ہو اُس دن لباس تبدیل کر آتے ہیں"۔

مَیں:۔ "کچھ اُداس رہتے ہیں کیا، اُن کے ہونٹوں پر مَیں نے کبھی مسکراہٹ نہیں دیکھی۔ ویسے کام کو ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اندر ہی اندر کُڑھتے رہتے ہیں"۔

والنٹیر:۔ "مگر کسی کو کچھ بتاتے نہیں ہیں۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے کئی مرتبہ اصرار کیا، جب بھی کچھ نہ بتایا۔ صرف اتنا کہا "مَیں نے گناہ کیا ہے اُس کا کفارہ کر رہا ہوں"۔

مَیں:۔ "عجیب و غریب آدمی ہے"۔

والنٹیر:۔ "مگر آدمی نہایت شریف ہیں، آپ کا کوئی کام ہو، رات کے دَہ بجے بُلا بھیجئے، بلا عذر چلے آئیں گے۔ کیا مجال جو ایک دفعہ بھی انکار کر جائیں اور پھر محنتی اتنے ہیں کہ سارا دن رات کام کراتے رہیئے۔ آنکھ بھی نہ جھپکائیں گے"۔

میری حیرت اَور بھی بڑھ گئی، والنٹیر کے چلے جانے پر بار بار

سوچتا تھا۔ اس کی تہ میں ضرور کوئی گہرا راز ہے۔ کوئی چھپا ہوا واقعہ، مگر وہ کیا ہے؟ اس شخص نے کونسا ایسا گناہ کیا ہے جس کا کفارہ کرنے کے لئے اپنے آپ کو خود ذلیل کر رہا ہے؟ شام کا وقت تھا میرا لیکچر شروع ہونے میں ایک گھنٹہ باقی تھا۔ پنڈال میں لوگ ابھی سے جمع ہو رہے تھے۔ ان کے شور و غل کی آوازیں میرے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔ مگر مجھے لیکچر کی ذرا بھی پروا نہ تھی۔ کسی دوسرے وقت میں میری تمام تر توجہ لیکچر کی تیاری کی جانب مبذول ہوتی۔ لیکن اِس وقت میرے دماغ میں ماسٹر آتمارام کے سوا۔ دوسرا کوئی خیال نہ تھا۔

اِتنے میں دروازہ کھُلا، اور ایک شخص اندر داخل ہُوا۔ مَیں چارپائی سے اُچھل پڑا۔ یہ ماسٹر آتمارام تھے۔ اس سے پہلی رات کو بھی میرا لیکچر تھا، اور ہجوم کے زیادہ ہونے کے باعث میرا گلا بیٹھ گیا تھا۔ ڈاکٹر دت نے میرے لئے گلے کی ٹکیاں بھیجی تھیں۔ تاکہ لیکچر کے وقت آسانی ہو۔ ماسٹر آتمارام وہی ٹکیاں لے کے آئے تھے۔ اُنہوں نے ٹکیوں کی شیشی میز پر رکھ دی۔ اور آہستہ سے پُوچھا "آپ کھانا کب کھائیں گے، اِسوقت یا لیکچر کے بعد۔ اگر اِس وقت کھانا ہو تو لے آؤں"۔

مَیں نے اِس سوال کا جواب نہ دیا، اور اُٹھ کر اُن کا ہاتھ تھام لیا، وہ کچھ گھبرا گئے۔ شاید اُن کو مجھ سے اِس محبت آمیز سلوک کی توقع نہ

تھی۔ مَیں نے شکوہ آمیز لہجہ میں کہا "ماسٹر صاحب! مجھے آپ سے بے حد گلہ ہے، آپ نے مجھے سخت دھوکا دیا مجھے معلوم نہ تھا ورنہ مجھ سے ایسی گستاخی کبھی نہ ہوتی"۔

ماسٹر صاحب نے میری طرف حیرت سے دیکھا، اور کہا، "آپ کیا فرما رہے ہیں۔ مَیں آپ کا منشا نہیں سمجھ سکا ہوں"۔

مَیں اِس کے جواب میں ان کو گھسیٹ کر اپنی چارپائی کے قریب لے گیا اور اپنے ساتھ بٹھا لیا، مگر وہ جدوجہد کرنے لگے، بولے "یہ آپ کیا کرتے ہیں، مَیں فرش پر بیٹھوں گا"۔

مَیں (ہنس کر) "چُپ چاپ بیٹھے رہیئے، ورنہ مَیں تشدّد پر اُتر آؤنگا"۔

آتمارام "مَیں آپ کے پیروں میں بیٹھوں گا"۔

مَیں "پیروں میں بہت بیٹھ چکے، اب سر پر بیٹھنا ہوگا"۔

آتمارام نے میری طرف اِس طرح دیکھا جیسے مَیں اُن پر ظلم کر رہا ہوں، جیسے اُن کے قلب کو انتہا درجہ کا صدمہ پہنچ رہا ہے۔ اُن کی آنکھیں آبگوں ہو گئیں، گلا بھی بھر آیا، منت آمیز لہجے میں بولے "مجھے مجبور نہ کریں، مَیں آپ کے ساتھ نہ بیٹھوں گا"۔

مَیں "مگر کیوں، آخر ساتھ بیٹھنے میں کیا حرج ہے۔ تُم شریف ہو، تعلیم یافتہ ہو، ایک ہائی سکول کے سیکنڈ ماسٹر ہو، پھر بھی......

آتمارام ۔ "میں اس کا اہل نہیں ہوں، مجھے اس سے دُکھ ہوتا ہے"۔
میں نے چھوڑ دیا، وہ فوراً فرش پر بیٹھ گئے، اب ان کا چہرہ پھر مطمئن تھا۔ جیسے مچھلی کو پانی مل جائے۔ قدرے ہنس کر بولے "میری جگہ یہی ہے"۔

میں نے اُن کے کندھے پر شفقت سے ہاتھ رکھا اور اُن کی آنکھوں میں اپنی آنکھیں ڈال کر نہایت محبّت سے کہا، "اپنی کہانی کہیئے۔ میں اُسے سُنے بغیر یہاں سے نہ اُٹھوں گا"۔

ماسٹر آتمارام نے ایک آہ سرد بھری اور سر جھکا کر جواب دیا۔ "مجھ سے ایک گُناہ سرزد ہو گیا ہے، بس یہی میری کہانی ہے"۔

میں ۔ "نہیں، میں مکمّل واقعہ سُننا چاہتا ہوں"۔

آتمارام ۔ "اِس سے کچھ حاصل نہ ہوگا، اُلٹے آپ بھی غمگین ہو جائیں گے"۔

میں ۔ "آپ کے دل کا بار تو ہلکا ہو جائیگا"۔

آتمارام ۔ "میں نے یہ واقعہ آج تک کسی سے نہیں کہا"۔

میں ۔ "شاید اتنی ہمدردی سے کسی نے پُوچھا بھی نہ ہو"۔

آتمارام (بے بس ہو کر) تو پھر کسی وقت سہی ۔ اس وقت تو آپ کا لیکچر ہے ۔ آپ سُنتے ہیں، کتنا شور ہو رہا ہے، پانچ ہزار سے کم آدمی نہ ہونگے ۔ میری داستان خونیں سُن کر آپ کا دل اُبھر آئیگا تو

لیکچر نہ دے سکیں گے"؛

مَیں :۔ "مجھے اِس وقت لیکچر کا ذرا بھی خیال نہیں ہے، تُم اپنی کہانی کہو، میرے دل میں نہ جانے کیا ہو رہا ہے، تُم پس و پیش کرتے ہو۔ میری آتشِ شوق اَور بھی تیز ہوتی جاتی ہے۔ جب تک سُن نہ لونگا چین نہ آئیگا"؛

آتما رام میرے مُنہ کی طرف دیکھنے لگے؛

مَیں نے جھک کر اُن کے کندھوں پر دونوں ہاتھ رکھ دیئے، اور لجاجت سے کہا، اب تو آپ کو سُنانا ہی پڑے گی دیر کرنے سے کیا حاصل؛

آتما رام نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے ایک گرم سانس چھوڑا اور اس کے بعد آہستہ آہستہ یُوں کہنا شروع کیا:۔

(۲)

پنڈت جی! مَیں جالندھر کا رہنے والا ہوں، میرے والد وہاں کپڑے کی دکان کرتے تھے، وہ بہت امیر نہ تھے مگر غریب بھی نہ تھے۔ ان کا شمار شہر کے معززین میں تھا۔ ان کی بات ٹالنے کی کسی میں ہمت نہ تھی۔ یہاں تک کہ شہر کے غنڈے بھی اُن کے رُوبرو سر نہ اُٹھاتے تھے اُن کی راست گفتاری اور صاف گوئی کے قصّے جالندھر میں آج بھی زبان زدِ خلائق ہیں۔ مگر وائے قسمت! مجھ بدبخت کے نصیب ہی میں

ان کا سایۂ عاطفت نہ لکھا تھا۔ میں ابھی دو ہی سال کا تھا کہ ان کا انتقال ہو گیا۔ مجھے اُن کی صورت بھی یاد نہیں، بھگوان جانے کیسے تھے کیسے نہ تھے۔

میری پرورش میری بیوہ ماں نے کی۔ اُن کی ایک سہیلی شواں ہوشیارپور کی رہنے والی تھی، وہ بھی بیوہ تھی۔ دونوں میں بہت محبت تھی۔ ان کی محبت دیکھ کر شبہ ہوتا تھا کہ وہ سکھیاں نہیں حقیقی بہنیں ہیں جب کبھی ملنے کا اتفاق ہوتا تو ساری ساری رات باتیں کرتی رہتیں رات ختم ہو جاتی، ان کی باتیں ختم نہ ہوتیں۔ وہ پیار، وہ راہ و رسم، وہ خلوص آج بھی یاد آتا ہے۔ تو دل میں ہوک سی اُٹھتی ہے۔ اس کی ایک لڑکی تھی کملا، مجھ سے تین چار سال چھوٹی ہو گی۔ دونوں سکھیوں نے مل کر ہماری سگائی کر دی۔ ان کے پاس جو کچھ تھا اُنہوں نے ایک دُوسری کو دینے کا فیصلہ کر لیا۔

اس وقت میں انٹرنس پاس کر کے کالج میں داخل ہُوا ہی تھا۔ سگائی ہونے پر مجھے دلی خوشی ہوئی۔ میں نے کملا کو صرف ایک آدھ مرتبہ دیکھا تھا، وہ بھی بچپن میں، اُس کی شکل و صورت رنگ رُوپ مجھے کچھ بھی یاد نہ تھا۔ لیکن اس کے باوجود مجھے خوشی ہوئی۔ جب گوشۂ تنہائی میں بیٹھتا اُس کی خیالی تصویر آنکھوں کے سامنے آ کر کھڑی ہو جاتی۔ مجھے ایسا

معلوم ہوتا تھا جیسے ایک بہت خوبصورت، بھولی بھالی، ہنس مُکھ لڑکی حیا سے گردن جھکائے میری طرف محبّت آمیز نگاہوں سے تاک رہی ہے آہستہ آہستہ مجھے اِس خیالی تصویر سے محبّت ہونے لگی۔ میں نے اس خیالی تصویر کو ایک جاندار شے سمجھ لیا جسے قُدرت نے محض میرے ہی لئے پیدا کیا ہے۔ لیکن تقدیر نے میرے لئے کچھ اَور ہی تجویز کر رکھا تھا جب میں ٹریننگ کالج میں داخل ہُوا تو ایک دن پتہ نہیں کس طرح میرے دل میں خیال پیدا ہُوا کہ اگر وہ میرے اس معیار پر پُوری نہ اُتری تو کیا ہوگا؟ زندگی تباہ ہو جائے گی۔ تمام اُمیدیں، تمام آرزوئیں مٹّی میں مِل جائیں گی میرا دل دہل گیا، یہ اندیشہ نہ تھا میری بربادی کا سنگِ بُنیاد تھا۔ کاش! وہ لمحہ میری زندگی سے خارج ہو جاتا۔ کاش مَیں اسوقت کے لئے سو جاتا، بیہوش ہو جاتا، زخمی ہو جاتا، تو آج میری زندگی شُعلۂ مضطر کی زندگی نہ ہوتی۔ اِس منحوس دن کے بعد میرے قلب کو حقیقی مسرّت کبھی میسّر نہ ہوئی۔ مَیں نے اِس وہم کو اِس اندیشہ کو دل سے دُور کرنے کی بہت سعی کی لیکن اندیشہ دُور نہ ہُوا۔ جیسے کنکھجورے کی زہریلی ٹانگیں ایک مرتبہ گوشت میں پیوست ہو کر کوشش کرنے پر بھی باہر نہیں نکلتیں، اور اندر دھنس جاتی ہیں۔ چند ہی دنوں کے بعد مَیں نے عزم کر لیا کہ کملا سے بیاہ نہ کروں گا، کسی اَور لڑکی سے دیکھ کر کروں گا۔ آج سوچتا ہوں

اُس وقت مجھے کیا ہو گیا تھا، نہ کچھ دیکھا نہ سُنا اور فیصلہ کر لیا، آدمی
سمجھتے اور سوچتے ہوئے بھی کیسے اندھا ہو جاتا ہے۔ یہ آج سمجھتا ہوں،
اُس وقت ذرا خیال نہ تھا ٭

(۳)

گرمی کی تعطیلوں میں گھر گیا، تو ایک دن ماں نے کہا۔ "کیوں بیٹا!
اب بیاہ کب کرے گا۔ شواں آئی تھی، کہتی تھی، لڑکی جوان ہو گئی ہے" ٭
مَیں کھانا کھا رہا تھا، چُپ چاپ کھاتا رہا ٭
ماں نے تھوڑی دیر میرے جواب کا انتظار کیا، اور پھر بولی "زمانہ
بڑا نازک ہے، لڑکیوں کو گھر میں بٹھا رکھنا ٹھیک نہیں" ٭
مَیں اب کے بھی چُپ رہا ٭
ماں "مَیں بھی اس دن کے لئے تڑپ رہی ہوں، جب میرا بچّہ سہرے
باندھ کر گھوڑی پر سوار ہو گا" ٭
مَیں نے پھر بھی جواب نہ دیا ٭
ماں۔ (میرے تھال میں بھاجی ڈالتے ہوئے) "تو اس بساکھ میں بیاہ
ہو جائے" ٭
اب خاموش رہنا مشکل تھا، مَیں نے آہستہ سے جواب دیا،
"مَیں ابھی بیاہ نہ کروں گا" ٭

ماں نے میری طرف محبّت بھری نگاہوں سے دیکھا اور کہا "کیا بُڈھا ہو کر بیاہ کرے گا؟ ذرا اس کی باتیں سُنو، کہتا ہے ابھی بیاہ نہ کروں گا، پنڈت گوکل چند کا لڑکا مایا دھاری تجھ سے تین ماہ چھوٹا ہے، اُس کا بیاہ ہوئے دو سال گزر گئے اور تُو ابھی کنوارا بیٹھا ہے۔

لالہ کرتا کرشن کا لڑکا چونی لال ......

مَیں۔ (بات کاٹ کر) "مجھے اَوروں سے کیا غرض ہے، مَیں تو ابھی بیاہ نہ کروں گا"۔

ماں۔ "اچھا یہ بھی نہ سہی، تیرے باپ کا بیاہ جانتا ہے کب ہُوا تھا تیرہ سال کی عمر میں، مَیں اُس وقت آٹھ سال کی تھی"۔

یہ کہتے کہتے اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، اُس کی آواز گلے میں پھنس گئی۔ اس سے اَور نہ بولا گیا، وہ آہ سرد بھر کر دیوار کی طرف دیکھنے لگی۔ میرا بھی دل بھر آیا، ہاتھ کا لُقمہ ہاتھ ہی میں رہ گیا۔

تھوڑی دیر بعد اس نے پھر ٹھنڈی آہ بھری اور بولی "اگر آج تیرا باپ زندہ ہوتا تو کیا آج تک تُو اسی طرح کنوارا ہی رہتا۔ نہ بابا اب مَیں تیری ایک نہ سُنوں گی۔ تُو تو پاگل ہے، پڑھ لکھ گیا ہے تو کیا ہُوا ہے مگر ہے تو وہی پاگل کا پاگل"۔

مَیں نے ہنس کر جواب دیا، پاگل ہوں تو پاگل خانے بھیجو، بیاہ

کیوں کرتی ہو۔ اس سے تو معلوم ہوتا ہے تم بھی پاگل ہو گئی ہو"۔

اب ماں کو بھی ہنسی آ گئی، ٹھڈی پر اُنگلی رکھ کر بولی، "بابا پتہ نہیں یہ تُو نے اتنی باتیں کرنا کہاں سے سیکھ لیا۔ پر ایک بات کہے دیتی ہوں، تجھے اب بیاہ کرنا ہی پڑے گا"۔

مَیں نے کھانے کا تھال اپنے سامنے سے ہٹا دیا، اور کہا، "ماں! مَیں نے ایک مرتبہ کہہ دیا ہے کہ ابھی بیاہ نہیں کروں گا۔ اور یہ میرا آخری فیصلہ ہے"۔

شاید اب تک ماں کو یہی خیال تھا کہ یہ انکار زبان کا ہے دل کا نہیں لڑکے ماں باپ کے سامنے ایسا ہی کیا کرتے ہیں۔ لیکن میری آخری بات سُن کر وہ فکرمند ہو گئی اور آہستہ سے بولی، "تو کیا جواب دوں۔ کملا جوان ہو گئی ہے"۔

"مَیں یہ کہو، کسی اور سے بیاہ دے۔ ہندوستان میں آتمارام کے سوا اور بھی کئی لڑکے ہیں"۔

میری اِس بات سے ماں کے کلیجے میں تیر سا لگا۔ محبت کی مُورت نے غصّہ کی شکل اختیار کر لی۔ اس کی آنکھوں سے آگ کے شرارے نکلنے لگے، جیسے چندن کو رگڑا جائے تو اس سے آگ نکلتی ہے۔ گرج کر بولی "کیا کالج میں تُو نے یہی بے حیائی کی باتیں سیکھی ہیں، اگر

مرد ہوتا تو مر جاتا پر یہ بات زبان سے نہ نکالتا۔ اپنی منگیتر کی شادی دوسرے مرد سے ہوتی دیکھے گا۔ اور پھر بھی زندہ رہے گا۔ کیوں شرم تو نہ آتی ہوگی“ ؂

ماں کا یہ رُوپ دیکھ کر میرا خُون سرد ہوگیا۔ میرے مُنہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلا، مُنہ میں زبان تھی، زبان میں بولنے کی طاقت نہ تھی میں چاہتا تھا، ماں ایک مرتبہ پھر اسی طرح پیار سے اور اپنا حق جتا کر کہدے ”تجھے بیاہ کرنا ہوگا“ اور میں سر جھکا کر منظور کر لوں۔ ایک دفعہ بھی انکار نہ کروں۔ لیکن ماں نے یہ لفظ نہ کہے، اور جا کر چارپائی پر لیٹ گئی۔ میں باہر چلا گیا۔ اب میں پھر وہی سرکش، وہی احمق آتما رام تھا جس نے نہ کچھ دیکھا نہ سُنا اور یُونہی سمجھ لیا کہ کملا بدصُورت ہے۔ اوّل اوّل یہ خیال نرم نازک پودا تھا جسے اُکھاڑنا ذرا بھی مشکل نہیں ہوتا۔ آدمی چاہے تو بیر سے بھی اُکھاڑ لے لیکن اب وہ خیال تناور درخت بن چکا تھا جسے ہاتھی ہلانا چاہے تو بھی نہ ہلا سکے پرماتما جانے دُنیا میں میرے جیسے کتنے بدنصیب ہیں جو اپنے ہی وہموں کی دُنیا میں بھٹک بھٹک کر تباہ و برباد ہو جاتے ہیں ؂

(۴)

چند دن کے بعد ہوشیارپور سے خط آیا کہ جلدی اطلاع دو تو تیاریاں شروع کر دوں، مجھے تو برادری میں مُنہ دکھانا بھی مشکل ہو گیا ہے خط پڑھ کر میں سوچنے لگا، ماں کو دکھاؤں یا نہ دکھاؤں، پھر سر پر سوار

ہو جائے گی، پھر وہی گالیاں ملیں، عجب نہیں زبردستی بیاہ کر دے
مَیں گھبرا گیا، کوئی راستہ نظر نہ آتا تھا۔ دو دن پریشان رہا، کیا کروں
اِس بیاہ کی زنجیروں سے کیسے بچوں؟ آخر تیسرے دن رستہ مل گیا
مَیں نے ماں کی طرف سے جواب لکھ دیا، وہ خط کچھ اِس طرح کا تھا۔

بہن! کیا کہوں، کہتے ہوئے بھی شرم آتی ہے، جی چاہتا ہے کہیں
ڈُوب مروں۔ تمہیں کبھی مُنہ نہ دکھاؤں، مگر اس میں میرا ذرا بھی قصور
نہیں، آتما رام ہی کی عقل پر پتھر پڑ گئے ہیں، کہتا ہے بیاہ نہ کروں گا۔
افسوس کیا ولولے تھے، کیا کیا اُمیدیں، سب پر پانی پھر گیا، کملا کو بہو
بنا کر مجھے کیسی خوشی حاصل ہوتی۔ لیکن افسوس!

بہن! مجھے آتما رام سے ذرا بھی امید نہیں، مَیں اُسے سمجھا سمجھا کر ہار
گئی، لیکن اس پر ذرا اثر نہیں ہوتا، یہ لکھواتے ہوئے جگر پھٹا جاتا ہے
لیکن کیا کروں، بھگوان کی یہی مرضی ہے، اب تم کملا کو کہیں اور بیاہ دو
پرماتما اُسے سُکھی رکھے،، تمہاری بد نصیب رام دیوی

پنڈت جی! یہ خط لکھوا کر مَیں ایسا خوش ہوُا، جیسے سر سے کوئی بار
اُتر گیا ہو جیسے کوئی خوفناک بیماری ٹل گئی ہو۔ کیا معلوم تھا کہ یہ خوفناک
بیماری نہیں ٹلی۔ مَیں نے زندگی کی سب سے بڑی بازی ہار دی ہے
مَیں کتنا پست خیال کس قدر ذلیل ہوں، اُس وقت مجھے ذرا خیال نہ آیا کہ

مَیں کیا کر رہا ہوں۔ ماں کو علم بھی نہ ہُوا اور شواں کے یہاں میرا خط جا پہنچا۔
بیساکھ کا مہینہ تھا، مَیں نے بی۔ ٹی کا امتحان دیا اور جالندھر چلا گیا
مجھے بڑا فکر تھا کہ میری کرتوت ماں پر ظاہر ہو گئی ہو گی۔ مگر میرا خیال غلط نکلا،
اُسے ابھی تک پتہ نہ تھا۔ محبت زیادہ خفا ہوتی ہے تو خاموش ہو جاتی
ہے، بولتی نہیں ہے۔ میرا خط پا کر شواں کتنی ناراض ہوئی ہو گی، یہ مجھ سے
چھپا نہ تھا، اِسی وجہ سے اُس نے خط وکتابت بند کر دی، اس نے شکایت کا
ایک خط بھی نہ لکھا لیکن یہ بات زیادہ چھپنے والی نہ تھی ایک دن ظاہر ہو گئی۔
شام کا وقت تھا مَیں سیر کر کے گھر لوٹا، تو ماں چُپ چاپ بیٹھی تھی،
آنکھیں رو رو کر سُرخ ہو گئی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی اس کی آنکھوں سے
پھر آنسو بہنے لگے۔ جیسے زخم پر چوٹ لگ جائے۔ روتے روتے بولی "بیٹا
تُو نے بُرا کیا، یہ تجھے واجب نہ تھا۔ غریب لڑکی کا دِل ٹُوٹ گیا ہے۔
جب سے تمہارا خط گیا ہے دن رات روتی رہتی ہے۔ اُس کے ماموں نے
ایک بر ٹھیک کیا ہے، مگر وہ کہتی ہے کہ میرا بیاہ تو ہو چکا، ہندو کی لڑکی
ہوں دُوسرا بیاہ نہ کروں گی، لیکن اس کا ماموں بیاہ پر تُلا ہُوا ہے۔
بھگوان جانے کیا ہو کیا نہ ہو۔ لیکن تُو نے بُرا کیا، مَیں شواں کو مُنہ دکھانے
کے لائق نہ رہی، ساری عُمر کی بنی ہوئی تُو نے پل میں بگاڑ دی۔ تُو نے اتنا
بھی خیال نہ کیا کہ یہ میری ماں ہے۔ اب بھی اگر کچھ کر سکے تو کر لے،

ورنہ مَیں کچھ کھا مروں گی"، یہ کہہ کر وُہ پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگی مَیں کاٹھ کے پتلے کی طرح سامنے کھڑا دیکھتا رہا۔ وُہ ساری رات جس طرح گزاری اُسے مَیں ہی جانتا ہوں ؞

دُوسرے دن مَیں ہوشیار پور کو روانہ ہُوا، مَیں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ جاتے ہی شواں کے پاؤں پکڑ لونگا، کہوں گا تُو میری ماں ہے مجھے معاف کر، اگر معاف نہ کر سکے تو سزا دے۔ لیکن وہاں پہنچا تو دروازے پر بیاہ کے نشان نظر آئے میرا کلیجہ سن سے ہو گیا، لیکن مَیں نے پھر بھی پروا نہ کی اور دوڑتا ہُوا اندر چلا گیا۔ اُس وقت اگر مجھے کوئی دیکھتا تو سمجھتا یہ پاگل ہے، اور مَیں سچ مچ پاگل ہی تھا۔ میری سوچنے سمجھنے کی قوت زائل ہو گئی تھی۔ مجھے معلوم نہ تھا مَیں کیا کر رہا ہوں۔ اندر پہنچا تو سامنے سے شواں آتی ہوئی نظر آئی۔ مگر اُس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی اُس کی آنکھوں سے آگ کے شعلے نکلنے لگے۔ جیسے کسی نے شیرنی کے بچے کو چھیڑ دیا ہو، دانت پیستی ہوئی بولی "تُو یہاں کیوں آیا ہے، کیا تجھے میری کملا کو قتل کر کے بھی اطمینان نہیں ہُوا" یہ کہہ کر وہیں سے لوٹ گئی ؞

(۵)

مجھے جیسے کسی نے کاٹھ مار دیا۔ میرے پاؤں وہیں جم گئے۔ گھر میں محلہ بھر کی عورتیں جمع تھیں۔ شواں کی ڈانٹ سُن کر اُن میں سے کچھ باہر

نکل آئیں۔ ان میں سے بعض مجھے پہچانتی تھیں۔ ایک بولی "ارے بیٹا! تُو نے ظلم کیا، یہ لڑکی نہ تھی ہیرا تھا، اسے ٹھکرا کر تیرا بھی بھلا نہ ہو گا، غریب نے زہر کھا لیا"۔

میرا سر چکرانے لگا، مجھے ایسا معلوم ہُوا جیسے یہ خواب ہے، سوچتا تھا ابھی آنکھ کھُل جائے گی، ابھی اِس ذہنی اذیّت کا خاتمہ ہو جائے گا اتنے میں دُوسری عورت نے کہا۔

دُوسری "ستی تھی ستی، شام کو بیاہ تھا اس وقت زہر کھا لیا"۔

تیسری "شاید بچ جائے"۔

مجھے پھر امید ہو گئی۔

دُوسری (سر ہلا کر) "اب کیا بچے گی، ڈاکٹر نے جواب دے دیا"۔

مَیں پھر مایُوس ہو گیا۔

تیسری "ڈاکٹر کوئی پرمیشور تھوڑا ہی ہے، بھگوان چاہے تو اب بھی بچالے تو جلتی آگ سے زندہ نکل آئے"۔

چوتھی "پرماتما کرے بچ جائے، غریب نے دُنیا کا دیکھا ہی کیا ہے"۔

پانچویں (رو کر) "کل مَیں پاس بیٹھی رہی، مجھ سے ذکر بھی نہیں کیا! البتّہ چُپ تھی۔ اب معلوم ہُوا وہ پہلے ہی فیصلہ کر چکی تھی"۔

دُوسری "اُداس تو اُسی دن سے تھی جس دن (میری طرف اشارہ کر کے)

اس کا خط آیا تھا۔ اُسی دن کے بعد اس کے چہرے پر کسی نے ہنسی نہیں دیکھی"۔

تیسری (مجھ سے) "کیوں بیٹا! اس میں کیا کیڑے پڑے تھے جو تُو نے جواب دے دیا۔ ایسی لڑکی تو ہمارے سارے شہر میں نہ ہوگی"۔

چوتھی (نفرت سے مُنہ پھیر کر) "بہن! تم بھی کس سے باتیں کرتی ہو، ایسے شخص کو تو مُنہ بھی نہ لگانا چاہیئے، آدمی کاہے کو ہے قصائی ہے"۔

پہلی ۔ (سرد آہ بھر کر) "واہ بہن کملا! اتنی جلدی چلی گئی، ارے ابھی تیری عُمر ہی کیا تھی"۔

مَیں چُپ چاپ کھڑا تھا، جیسے مُنہ میں زبان ہی نہیں، کیا کہتا کیا نہ کہتا۔ اتنے میں ایک لڑکی اندر سے دوڑتی ہوئی آئی، اور مجھ سے بولی۔ "جلدی آؤ، تمہیں بُلا رہے ہیں"۔

مَیں بھاگتا ہُوا اندر چلا گیا، وہ چارپائی پر پڑی تڑپ رہی تھی۔ جانکنی کی حالت میں بھی وہ کیسی حسین تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی بے رحم نے خوبصورت پھُول کو ٹہنی سے توڑ کر زمین سے پھینک دیا ہے اُس نے میری طرف دیکھا اور آنکھیں بند کرلیں۔ اس نگاہِ واپسیں میں کتنا پیار، کتنا درد، کتنا شکوہ بھرا تھا۔ یہ آج تک نہیں بھُول سکا۔

اُس کی ماں نے کہا، "کملا! (گھبرا کر جلدی سے) کملا!

مگر کملا کہاں تھی؟

عورتوں نے جلدی سے اس کے ہاتھ پر آٹے کا چراغ رکھ دیا، تو کیا سچ مچ اُس کی زندگی کا ناٹک ختم ہو گیا۔ اتنی جلدی، اِتنی چھوٹی عُمر میں؟ اُس کی ماں کے بین فضا میں گونجنے لگے "

(۶)

جب میں باہر نکلا تو آسمان چکر کھا رہا تھا، زمین گھوم رہی تھی اِدھر میرے سینہ کے اندر آگ لگی ہوئی تھی۔ پانچ سال گزر گئے ہیں وہ آگ اسی طرح سلگ رہی ہے۔ نہ دن کو چین آتا ہے نہ رات کو آرام مِلتا ہے۔ رات کو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی کندھے پکڑ کر ہلا رہا ہے، جاگتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی کمرے میں میرے چاروں طرف پھر رہا ہے۔ سوتا ہوں تو خواب میں خوفناک شکلیں دیکھ کر ڈر جاتا ہوں، اُس وقت میں اپنے آپ میں نہیں رہتا، میری چیخوں کی آواز سے محلّہ کے لوگوں کی نیند حرام ہو جاتی ہے۔ اب مجھے کوئی محلّہ میں مکان بھی نہیں دیتا، کہتے ہیں کون سارے محلّہ کی شکایتیں سُنے، تم پر تو روز رات کو بھوت سوار ہو جاتا ہے۔ بڑی دِقتوں کے بعد شہر سے باہر ایک مکان مِلا ہے، اُسی میں اپنی غم نصیب بڈھی ماں کے ساتھ اپنی تیرہ و تار زندگی کے دن پورے کر رہا ہوں، مگر آہ! وہ اُس کی

نگاہِ واپسیں، وہ اُس کی جوانی اور خوبصورتی کی موت ایک لمحہ کے لئے بھی فراموش نہیں ہوتی۔ کتنی وفا شعار تھی اُس نے مجھے دیکھا نہیں تھا، اُس نے مجھ سے گفتگو بھی نہ کی تھی، صرف نام کا تعلق تھا اُسی پر قربان ہو گئی۔ وہ عورت نہیں تھی کوئی ستی تھی، کیسی بلند خیال، کتنی غیرت پسند، آج بھی اس کی زندگی کے آخری لمحے میری آنکھوں کے سامنے پھر رہے ہیں۔ وہی مکان ہے، وہی آنگن وہی عورتوں سے بھرا ہوا کمرہ، اور وہی وہاں لیٹی ہوئی سورگ کی دیوی جو مجھے دیکھے بغیر مرنا بھی نہ چاہتی تھی۔ ہائے افسوس! میں نے کیا کر دیا آج پانچ سال سے اُسے یاد کر کے روتا ہوں مگر نہ وہ وفا کی دیوی بھولتی ہے نہ موت آتی ہے جو اس عذاب الیم سے رہائی ہو۔ اسی لئے بُرے کپڑے پہنتا ہوں، بُرا کھانا کھاتا ہوں، ذلیل سے ذلیل کام کر کے اپنے آپ کو اپنی اور دُوسروں کی نگاہوں میں ذلیل کرتا ہوں کہ شاید اسی طرح اس معصوم کے قتل کا کفارہ ہو جائے“۔

یہ کہتے کہتے اُن کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے، میری زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ ہاں سینہ میں ایک آگ لگ گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ اُٹھ کر میرا جُوتا لے آئے اور میرے سامنے رکھ کر بولے ”چلئے لیکچر کا وقت ہو گیا ہے“۔

کایا پلٹ

(۱)

گاڑی نے سیٹی دی اور آہستہ آہستہ چلنے لگی۔

درمیانہ درجہ کے ایک زنانہ ڈبے میں بیٹھی ہوئی رکھشا نے گھونگٹ کی آڑ سے باہر کی طرف دیکھا، اور حسرت کا ایک گہرا سانس لیا۔ پہلے گاؤں چھوٹا تھا اب ضلع بھی چھوٹ گیا۔ رکھشا نے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا کر سر جھکایا اور سوچنے لگی۔ دیکھیں اب پھر کب آنا ہو، اس وقت باپ آنگن میں چارپائی پر بیٹھا حقہ پی رہا ہو گا، ماں رسوئی میں کھانا پکا رہی ہو گی، چھوٹے بھائی کھیل رہے ہونگے۔ ایک طرف بھینس بندھی ہو گی۔ اُس کو ایسا معلوم ہوا جیسے باپ نے گھڑی نکال کر وقت دیکھا ہے اور کہا ہے، اب رکھشا گاڑی میں بیٹھ گئی ہو گی، پھر اُس کو ایسا معلوم ہوا کہ ماں کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے ہیں اور وہ اپنے

دوپٹے سے آنکھیں پونچھ رہی ہے۔ رکھشا کو ماں کی ایک ایک بات یاد آ کر بیتاب کرنے لگی۔ روانگی کے وقت اُس نے کس طرح سے اُسے گلے لگا کر پیار کیا تھا، کس طرح پھوٹ پھوٹ کر روئی تھی، جس وقت اُس نے رکشا کے شوہر سے کہا، "بیٹا! اب یہ تمہارے حوالے ہے، ہمارا حق آج سے ختم ہُوا" اُس وقت اُس کی آواز کس طرح کانپ رہی تھی۔ اُس نے کیسے منت آمیز لہجہ میں کہا تھا۔ اسے ہم نے بڑے لاڈ چاؤ سے پالا ہے، اُس کا دِل نہ دُکھانا۔ یہ سب باتیں یاد کر کے رکشا کا دل بھر آیا۔ اُس نے اپنا سر چوبی دیوار کے ساتھ لگا دیا اور رونے لگی ؛

گاڑی تیز ہوگئی تھی، درخت، کھیت، تار کے کھمبے اِس طرح اُڑے چلے جاتے تھے جیسے کوئی اپنے محبُوب سے ملنے جا رہا ہو۔ رکشا نے اپنے دِل کو سنبھالا، اور گھونگھٹ کا ایک کونا اُٹھا کر اِدھر اُدھر دیکھا، ڈبّے میں صرف ایک عورت تھی۔ بائیس تیئیس سال کا سن ہوگا، گورا رنگ، گول چہرہ، صراحی دار گردن، شکل وصُورت سے رُعب برستا تھا۔ اِتنے میں اُس کی نگاہیں بھی اُوپر اُٹھ گئیں۔ رکشا چونک پڑی یہ عورت ساوتری تھی، اُسی کے گاؤں کی رہنے والی، اُس کی شادی ہوئے ابھی چار ہی سال گزرے تھے۔ لیکن اتنے ہی قلیل عرصہ میں وہ کتنی

تبدیل ہو گئی تھی۔ اُس کو دیکھ کر گمان بھی نہ ہوتا تھا کہ وہ کسی گاؤں کی رہنے والی ہو گی، چہرے پر کیسی سنجیدگی تھی، کیسا دبدبہ، جیسے کوئی رانی ہو۔ رکشا اُسے تھوڑی دیر چُپ چاپ دیکھتی رہی اس کے بعد اُٹھ کر اُس کے پاس چلی گئی، اور بولی ؛

"واہ بہن اتنی جلدی بھول گئی"؟

ساوتری نے اُس کی طرف دیکھا، اور اُسے گلے سے لگا کر بولی، اری میری رکشا! تُو کہاں سے آگئی (مُسکرا کر) اِس کونے میں جو پارسل سا پڑا تھا، کیا تُو اسی میں سے نکلی ہے، آ، ایک دفعہ پھر گلے مل لیں (گلے ملنے کے بعد) واہ میرے پارسل تو کدھر جا رہا ہے"؟

رکشا:- "تمہارے پارسل کا بیاہ ہو گیا"۔

ساوتری:- "یہ تو صاف دکھائی دے رہا ہے، ورنہ جنگل کی یہ بندریا تو اِس طرح مُنہ چھپا کر خاموش بیٹھنے والی نہ تھی، معلوم ہوتا ہے پہلی دفعہ سُسرال جا رہی ہو"۔

رکشا:- "ہاں بہن، پہلی دفعہ، شادی تو دو سال ہوئے ہو گئی تھی، گونا اب ہُوا ہے"۔

ساوتری:- "کہاں بیاہ ہُوا ہے"؟

رکشا۔ (سر جھکا کر آہستہ سے) "سیالکوٹ"۔

ساوتری:۔ "جیجاجی کیا کرتے ہیں؟"
رکشا:۔ "لاہور میں نوکر ہیں۔"
ساوتری:۔ "لاہور میں (مسکرا کر) تب تو اکثر ملاقات ہوتی رہے گی۔ ہم بھی وہیں رہتے ہیں۔ جیجاجی کیسے ہیں، بدصورت تو نہیں؟"
رکشا (پھر سر جھکا کر اسی طرح آہستہ سے) "مجھے کیا معلوم؟ مَیں نے انہیں دیکھا تھوڑا ہے۔"
ساوتری:۔ "اور جو وہ اب کہیں گم ہو جائیں تو کیسے ڈھونڈو؟"
رکشا:۔ "تم کو بلا بھیجوں گی، آؤ گی نا؟"
ساوتری:۔ "ضرور آؤں گی، بشرطیکہ بھگتی سے بلاؤ۔"
رکشا:۔ "خیر تم اپنی سناؤ۔ کیا حال ہے؟"
ساوتری:۔ "بہن پرماتما کی کرپا سے کوئی تکلیف نہیں، وکالت کرتے ہیں تین چار سو روپیہ کی آمدنی ہو جاتی ہے۔ مزاج کے اتنے اچھے ہیں کہ تم سے کیا کہوں۔ جب دیکھو چہرہ گلاب کی طرح کھلا ہوا ہے۔ خفا ہونا تو جانتے ہی نہیں۔ مجھے پوری پوری آزادی دے رکھی ہے کہیں جاؤں آؤں ذرا اعتراض نہیں کرتے۔"
رکشا:۔ "تو کیا تم بازاروں میں گھومتی پھرتی ہو میم صاحب بن کر؟"
ساوتری (مسکرا کر) "تمہیں شاید معلوم ہی نہیں، وہ پردہ کے سخت خلاف

ہیں (بکس سے ایک کتاب نکال کر) دیکھو! انہوں نے ایک کتاب لکھی ہے۔ اس میں انہوں نے ہر طرح سے ثابت کر دیا ہے کہ پردہ کی رسم جہالت کی رسم ہے اور عورتوں کے لئے بے حد مضر ہے، اسے پڑھو تو تمہاری آنکھیں کھل جائیں "۔

رکشا (کتاب لے کر) "تو یہ کہو تم کو بھی انگریزوں کی ہوا لگ گئی "۔

ساوتری (مسکرا کر) "میں پہلے ہی پردہ کے حق میں نہ تھی "۔

رکشا "تو ننگے منہ بازار میں سے نکلتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آتی۔ کوئی اپنا آدمی دیکھ لے تو کیا کہے، میں تو مر جاؤں، جب بھی یہ بے غیرتی قبول نہ کروں۔ تو دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈالکر جاتے ہوگے، اور لوگ ہنستے ہونگے؟"

ساوتری "تمہیں ایک اور خبر بھی سنا دوں، انہوں نے ایک سوسائٹی قائم کی ہے۔ جس کا مقصد ہی یہ ہے کہ اس بیہودہ رسم کا قلع قمع کیا جائے۔ اِس سلسلہ میں اکثر پنجاب کے اکثر مقامات میں ان کے لیکچر ہو چکے ہیں، آئندہ مہینے سیالکوٹ بھی آئیں گے، اگر کہو تو میں بھی چلی آؤں، مگر ایک شرط ہے "۔

رکشا "کیا؟"

ساوتری "تمہیں بھرے جلسہ میں کہنا ہوگا کہ یہ پردہ لغو رسم ہے، اور

عورتوں پر بدترین ظلم ہے"۔

رکشا:- مجھ سے یہ اُمید نہ رکھو، اگر صرف عورتوں کا جلسہ ہو تو میں اُٹھ کر تمہاری وہ گت بناؤں کہ تم کو بھاگتے ہوئے رستے نہ ملے"۔

ساوتری:- بڑی تیس مار خاں ہو، جلسہ میں کھڑا کر دیں تو پسینہ آ جائے زبان نہ کھلے۔ بلکہ میرا تو خیال ہے تھر تھر کانپنے لگو"۔

رکشا نے زور سے ہنس کر کہا" بہن! یہ تو بالکل ٹھیک ہے، تو کیا تُم وہاں بھی اِس طرح فر فر بول سکتی ہو؟"

ساوتری:- حرج کیا ہے، کوئی مُنہ میں تھوڑا ہی ڈال لیگا"۔

رکشا:- مگر میں تو ایک لفظ بھی نہ بول سکوں، بولنا چاہوں جب بھی مُنہ سے نہ نکلے، اپنے چاروں طرف آدمی دیکھ کر ہی گھبرا جاؤں"۔

ساوتری:- اور یہ پردے کا سب سے تاریک پہلو ہے، یہ عورتوں کو بودا بنا دیتا ہے۔ ان کا حوصلہ پست ہو جاتا ہے، ان کی جُرأت مر جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کبھی خطرے میں پڑ جائیں تو تباہ ہو جائیں گی۔ جان دے دینگی مگر ان سے اتنا نہ ہو گا کہ ڈٹ کر کھڑی ہو جائیں یا شور ہی مچادیں"۔

رکشا:- اور تم کیا کرو؟

ساوتری:- کوئی ٹیڑھی نگاہوں سے دیکھ بھی جائے تو جوتے مار مار کر

سر کے بال اُڑا دوں، ذرا بھی لحاظ نہ کروں"۔

رکشا: "کہنا آسان ہے مگر وقت پر کسی کی بھی ہمّت نہیں پڑتی۔ ہاتھ ہی نہیں اُٹھتے"۔

ساوتری: "اب اپنے مُنہ سے کیا کہوں، ہاں اگر موقعہ ملے تو دکھادوں کہ ہاتھ اُٹھتے ہیں یا نہیں۔ (گاڑی کو رُکتے دیکھ کر) لو وزیر آباد آگیا۔ یہاں تمہیں اُترنا ہوگا، میں تو سیدھی لاہور جاؤں گی۔ لو خط لکھتے رہنا، میرا پتہ کتاب میں ہے"۔

رکشا اپنے کپڑے ٹھیک کر کے کھڑی ہوگئی، اور مُنہ پر گھونگٹ کھینچ لیا۔

ساوتری یہ دیکھ کر مُسکرائی اور بولی "تو سیالکوٹ آؤں یا نہ آؤں؟"

رکشا (گھونگھٹ کے اندر سے اس کی طرف دیکھ کر آہستہ سے) "نہ کیوں آئیں؟ ضرور آؤ، میں اپنا پتہ لکھ بھیجوں گی"۔

اتنے میں گاڑی ایک جھٹکے کے ساتھ کھڑی ہوگئی۔ ساوتری نے کہا "مگر میری شرط یاد ہے نا، تمہیں بھرے جلسہ میں کھڑے ہو کر پردے کے خلاف بولنا ہوگا"۔

رکشا (آہستہ سے) پہلے تم کسی کو جُوتے مار کر دکھا دو، پھر میں بھی کہہ دوں گی پردہ بُرا، بلکہ ......

اور فقرہ پُورا ابھی نہ ہونے پایا تھا کہ رکشا کا خاوند آ کر اُس ڈبے کے سامنے کھڑا ہو گیا، رکشا گھونگھٹ کو اور بھی لمبا کر کے گاڑی سے اُتر گئی۔ ساوتری نے زور سے ہنس کر کہا "کہیں گر نہ جانا"۔

معاً کئی عورتیں اسی ڈبہ میں سوار ہو گئیں، ساوتری دیکھتی رہ گئی۔ ادھر رکشا لمبا گھونگھٹ کاڑھے مسافروں کے ریلے میں دھکے کھاتی ہوئی چُپ چاپ اپنے خاوند کے پیچھے پیچھے روانہ ہوئی۔ نوعمر ناتجربہ کار خاوند بھیڑ کو دونوں ہاتھوں سے اِدھر اُدھر ہٹاتے ہوئے آگے بڑھا جاتا تھا۔ غریب کبھی قُلی کی طرف دیکھتا تھا جو اُس کا اسباب اُٹھائے آگے آگے جا رہا تھا، کبھی بیوی کی طرف دیکھتا تھا جو گھونگھٹ کاڑھے پیچھے پیچھے آ رہی تھی۔

معاً رکشا کے مُنہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی، اُس نے ہاتھ سے گھونگھٹ کو قدرے اُونچا اُٹھایا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا، مگر اُسے اپنا خاوند نظر نہ آیا۔ کدھر چلے گئے ابھی تو آگے آگے جا رہے تھے، میں برابر اُن کے پیچھے پیچھے چل رہی ہوں، کہیں ایک منٹ کے لئے نہیں رُکی، ایک قدم بھی اِدھر اُدھر نہیں ہوئی، پھر کہاں غائب ہو گئے، کہیں پیچھے نہ رہ گئے ہوں۔ رکشا کے پاؤں رُک گئے، اُس نے پیچھے مُڑ کر دیکھا مگر وہ وہاں بھی نہ تھے۔ مسافر دوڑتے ہوئے آ رہے تھے،

ہر ایک کو جلدی تھی کہ کہیں ایسا نہ ہو ہیں رہ جاؤں اور گاڑی چل دے۔ مُسافروں کے اِس سیلاب میں رُکنا آسان نہ تھا۔ رکشا کبھی ادھر لڑھکتی تھی، کبھی اُدھر یہاں تک کہ ایک ریلے میں وہ کہیں سے کہیں جا پہنچی۔ تب وہ بمشکل تمام بھیڑ سے باہر نکلی اور سر جھکا کر ایک طرف کھڑی ہو گئی۔ اُسے اُمید تھی کہ خاوند ڈھونڈتا ہو گا، مجھے دیکھ کر خود بخود اسی طرف کو چلا آئیگا۔ مگر کئی منٹ گزر گئے۔ اور ادھر کوئی بھی نہ آیا۔ رکشا گھبرا گئی غریب کیا کرے۔ اپنے خاوند کو کیسے تلاش کرے۔ اس نے اُسے دیکھا بھی نہ تھا نہ اس کا لباس شناخت کرتی تھی۔ وہ صرف اتنا جانتی تھی کہ خاوند بادامی رنگ کا بُوٹ پہنے ہے۔ مگر دیکھتے دیکھتے کئی بادامی بُوٹوں والے آئے اور آگے نکل گئے۔ رکشا کے پاس کوئی بھی نہ رُکا۔ ساری گاڑی میں آدمی بھرے تھے۔ مگر رکشا کا خاوند کہاں تھا؟ اتنے میں گاڑی نے سیٹی دی۔ اور اس کے بعد چلنے لگی۔ رکشا کو ایسا معلوم ہُوا جیسے یہ گاڑی نہیں جا رہی اس کے پران جا رہے ہیں۔ جیسے اب اس کے بچاؤ کی کوئی صُورت نہیں رہ گئی۔ اس نے گھونگٹ کا ایک کونا اُٹھا کر چلتی ہوئی گاڑی کی طرف دیکھا اور دل ہی دل میں پرماتما سے پرارتھنا کرنے لگی کہ گاڑی ذرا رک جائے مگر گاڑی نہ رُکی دیکھتے دیکھتے پلیٹ فارم خالی ہو گیا، قلی اور خوانچے والے

بھی دوسرے پلیٹ فارم پر چلے گئے۔ ابھی وہاں کتنا شور تھا کتنے آدمی جمع تھے، کان پڑی آواز سُنائی نہ دیتی تھی مگر اب بجز ایک پھڑی ہوئی کم سِن دُلہن کے کوئی بھی نہ تھا۔ رکشا نے دیوار کی طرف منہ کر لیا اور اپنی کم نصیبی پر پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگی۔

شام کے وقت ریلوے کے ایک بابو کا اِدھر سے گزر ہُوا، وہ اپنے گھر جا رہا تھا۔ رکشا کو دیکھ کر ٹھٹک گیا، یہ کون ہے؟ کوئی آدمی بھی قریب نہیں، سارا پلیٹ فارم خالی ہے، اکیلی یہاں کیا کر رہی ہے۔ یکایک اُسے یاد آیا۔ میں نے اسے دوپہر کو دیکھا ہے، اُس وقت بھی یہ تنہا تھی کوئی ساتھ نہ تھا، ضرور گاڑی سے رہ گئی ہے بابو آہستہ آہستہ آگے بڑھا، رکشا نے اُس کے پاؤں کی چاپ سُنی تو اُس نے چونک کر سر اُٹھایا اور بابو کے پاؤں کی طرف دیکھا کہ شاید بادامی بُوٹ والا آگیا ہو مگر ایسی قسمت کہاں؟ رکشا نے آہ سرد بھری اور پھر سر جُھکا لیا۔

بابو۔ (رکشا کو سر سے پاؤں تک دیکھ کر) "تم یہاں کھڑی کیا کر رہی ہو؟"

رکشا نے گھونگٹ اور بھی نیچے کھینچ لیا اور جواب نہ دیا۔

بابو۔ "تمہارے ساتھ کوئی مرد بھی ہے یا نہیں؟"

رکشا نے سر ہلا کر اشارہ سے کہا "نہیں"۔

بابو کی آنکھیں چمکنے لگیں، سگرٹ کا کش لگا کر بولا "تو تم یہاں

اکیلی کیسے آ گئی، کہاں سے آ رہی ہو؟"

رکشا نے بہت آہستہ سے جواب دیا" گجرات سے"۔

بابو" تمہارا ٹکٹ کہاں ہے؟ دکھاؤ ہے یا نہیں"۔

رکشا کو ایسا معلوم ہوا جیسے منہ سوکھ گیا ہے، جیسے اس کی زبان تالو سے چمٹ گئی ہے، اس نے بولنا چاہا مگر الفاظ حلق میں پھنس گئے اس وقت خیال آیا، کل اس وقت آرام و اطمینان سے اپنے گھر میں بیٹھی تھی، کوئی فکر تک نہ تھا، کوئی تردد نہ تھا۔ اور آج ......

رکشا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، اس نے آہ سرد بھری اور سوچا اب کیا ہو گا؟

بابو (ذرا سختی سے) "تمہارا ٹکٹ کہاں ہے، بولتی ہو یا نہیں؟"

رکشا تھر تھر کانپنے لگی، بولی" بابو جی! مجھ پر مہربانی کیجئے، پرماتما آپ کا بھلا کرے گا"!

بابو۔ (رعب کے ساتھ) "ٹکٹ لاؤ"۔

رکشا۔ (روتے ہوئے) "ٹکٹ اُن کے پاس ہے"۔

بابو۔ (غصہ سے) "تو اُن کو بلاؤ، کہاں ہیں؟"

رکشا۔ (آہ سرد بھر کر) "اب بابو جی مجھے کیا معلوم کہاں ہیں، بھیڑ میں ساتھ چھوٹ گیا، پھر پتہ نہیں، کہاں چلے گئے ہیں"!

بابو:- "نہایت عجیب بات ہے کہ مرد اپنی بیاہی ہوئی عورت کو یوں چھوڑ جائے۔ خیر ہمیں اس سے کچھ سروکار نہیں، کرایہ دو"۔

بلی کے پنجہ میں پھنس کر چوہے کی بھی ایسی حالت نہ ہوتی ہوگی جو اسوقت رکشا کی تھی، دِل ہی دل میں ہاتھ جوڑ رہی تھی، بھگوان سے پرارتھنا کر رہی تھی کہ کسی طرح سے یہ بلا ٹل جائے، کاش یہاں ساوتری ہی ہوتی۔

بابو نے چاروں طرف دیکھا، بالکل سنسان تھا تب اُس نے رکشا کے پاس کھسک کر آہستہ سے کہا "کہو تو اپنی گرہ سے کرایہ دے کر رسید کاٹ دُوں، کیا حرج ہے، صرف ایک مرتبہ مسکرا کر کہہ دو ہاں ہمارا دل اسی میں خوش ہو جائیگا"۔

رکشا کے کانوں میں جیسے کسی نے گرم سیسہ اُنڈیل دیا، وہ ناتجربہ کار تھی مگر بے وقوف نہ تھی۔ وہ سب کچھ سمجھتی تھی، اُس کا جی چاہتا تھا اِس شیطان کا مُنہ نوچ لے، اگر بس چلے تو گردن مروڑ دے، لیکن غصہ ہوتے ہوئے بھی اُس کے دل میں ہمّت نہ تھی، کمزور کو غُصّہ چڑھتا ہے، تو روتا ہے، اِس سے زیادہ اُس سے کچھ ہو ہی نہیں سکتا، رکشا بھی رونے لگی۔

یکایک بابو چونک پڑا۔ پلیٹ فارم کے دُوسرے سرے سے

ایک عورت آ رہی تھی، دیکھتے دیکھتے وہ آ کر اُن کے قریب کھڑی ہو گئی۔ رکشا نے اطمینان کا سانس لیا، اور اس کے کان کے پاس اپنا مُنہ لے جا کر، بہت ہی آہستہ سے کہا "بہن مجھے بچاؤ یہ شیطان......"

اس سے آگے اُس کی زبان رُک گئی، مگر عورت نے سب کچھ سمجھ لیا۔ اُس کی آنکھوں سے آگ کی چنگاریاں نکلنے لگیں، اُس نے بابو کی طرف اِس طرح دیکھا جیسے اُسے کھا ہی جائے گی، اور غصّہ سے بولی "تمہاری اپنی ماں بہن کوئی ہے یا نہیں"؟

رکشا اُچھل پڑی، یہ تو ساوتری ہے، اُس کی جان میں جان آئی، جیسے کسی ڈُوبتے کو ساحل مل جائے۔ اب اسے کوئی فکر کوئی اندیشہ نہ تھا۔ اس وقت وہ اپنے آپ کو ایسا محفوظ سمجھتی تھی گویا اپنے گھر میں کھڑی ہے یا ماں کی گود میں بیٹھی ہے۔

ساوتری نے بابو کی طرف قہر بھری نگاہوں سے دیکھا اور پھر پُوچھا "تمہارے گھر میں کوئی ماں بہن ہے یا نہیں؟ جو اس طرح شریف عورتوں کو تنگ کرتے ہو"۔

بابو پر رُعب چھا گیا، یہ عورت ضرور کسی بڑے گھر کی ہے اور تعلیم یافتہ ہے، ورنہ ایسی آزادی اور بے خوفی سے کبھی کلام نہ کرتی سوچنے لگا اب کیا کریں، کیسے چھٹکارا ہو۔ تھوڑی دیر بعد بولا "میں نے صرف اتنا ہی کہا تھا

کہ یا ٹکٹ دکھاؤ یا کرایہ دو۔ اِس سے زیادہ مَیں نے ایک لفظ بھی نہیں کہا، مگر یہ رونے لگی"۔

ساوتری نے رکشا کے پاس مُنہ لے جا کر پُوچھا "کرایہ مانگتا تھا یا کچھ اور بھی کہتا تھا؟

رکشا نے اس کے کان میں بہت ہی آہستہ سے رُک رُک کر کہا "یہ کہتا تھا، ذرا مُسکرا دو تو تمہارا کرایہ اپنی گرہ سے دیدوں ہمارا دِل اسی میں خوش ہو جائیگا" یہ کہہ کر وہ پھر رونے لگی۔

ساوتری نے یہ لفظ سُنے تو اُسے زہر چڑھ گیا، بولی "تمہارا نام کیا ہے؟"

بابو "تم میرا نام پُوچھنے والی کون ہو؟"

ساوتری "لال لال آنکھیں نکال کر) "مَیں کوئی ہوں، اِس سے کیا تم اپنا نام بتاؤ"۔

اب بابو ڈر گیا، تاہم حوصلہ کرکے بولا "واہ چلی ہیں ہمیں دھمکانے اُن سے نہیں کہتیں کہ بغیر ٹکٹ کے گاڑی پر کیوں سوار ہوئی تھیں"۔

ساوتری نے آگے بڑھ کر اُس کی گردن پر ہاتھ رکھ دیا اور اُسے جھنجھوڑ کر کہا "تم اپنا نام بتاؤ گے یا نہیں (رُعب کے ساتھ) بولو، تمہارا نام کیا ہے؟ مَیں تمہاری رپورٹ کروں گی"۔

جب ہم مایوس ہوتے ہیں تو دلیر ہو جاتے ہیں، بابو بھی مایوسی میں دلیر ہو گیا۔ اُس نے ساوتری کا ہاتھ جھٹک دیا، اور کہا "خبردار! میں طرح دیئے جاتا ہوں، تم شیر ہوتی جاتی ہو، لیکن اتنا سمجھ لو کہ اگر میں نے کچھ کہہ دیا تو آبرو دو کوڑی کی بھی نہ رہے گی باقی رہی بات رپورٹ کرنے کی، شوق سے کرو، میرا بگڑتا ہی کیا ہے؟"

اب ساوتری سے ضبط نہ ہو سکا، آن واحد میں اُس نے پاؤں سے جُوتا نکال کر بابُو کے سر پر دو چار رسید کر دیئے، یہ واویلا سُن کر سٹیشن کے دو چار اور بابو بھی ذرا فاصلے پر آ کھڑے تھے، وہ ہیں ہیں کرتے ہی رہ گئے اور بابو کی مرمّت ہو گئی، لڑائی میں جو پہل کر جائے وہی جیت جاتا ہے، بابو کے ہوش و حواس جاتے رہے، وہ بوکھلا سا گیا تھا، اُس سے اتنا بھی نہ ہوا کہ ساوتری کو پرے دھکیل دے جب جُوتے پڑ چکے تو دُوسرے بابوؤں نے آکر ساوتری سے کہا "آپ نے یہ جُوتے مارنے کی بات بیجا کی، زبان سے جو چاہتیں کہہ لیتیں حرج نہ تھا"۔

لیکن ساوتری بپھری ہوئی شیرنی کے مانند غرّا کر بولی "تم جُوتوں کی کہتے ہو، یہ ایک لفظ بولے تو میں اس کا لہو پی جاؤں، یہ پردہ نشین عورتوں کی بے عزّتی کیوں کرے"۔

بابو چُپ چاپ کھڑا تھا، جیسے اُس کے مُنہ میں زبان ہی نہیں،

وہ اب بھی کانپ رہا تھا، اور در اصل یہ وہ نہیں کانپتا تھا اس کے گناہ کانپتے تھے۔ ایک بابو اسے پکڑ کر باہر لے گیا، دوسرے نے کہا اس کے سر پر بھی بھوت سوار تھا، ہم لوگ سمجھا سمجھا کر تھک گئے یہ کسی کی سنتا ہی نہ تھا۔ آپ نے سبق دیدیا، خوب پٹا ۔

ساوتری ۔ اگر آپ نہ آجاتے تو ابھی اور پٹتا ۔

دوسرا ۔ بہن! میرا تو جی خوش ہو گیا، جو شریف عورتوں پر نظر بد ڈالے وہ آدمی ہماری ہمدردی کا ذرا مستحق نہیں، کیا چپ تھا جانتا تھا یہ سب میرے دشمن کھڑے ہیں بات بڑھی تو سب کے سب خلاف ہو جائیں گے، میرے حق میں ایک بھی نہ ہو گا ۔

تیسرا ۔ لیکن آپ نے بہت جرأت سے کام لیا، اگر ایسے دو چار واقعات ہر مہینے ہو جایا کریں تو بدمعاشوں کو کان ہو جائیں پھر کسی کی طرف آنکھ نہ اٹھائیں ۔

(۳)

تھوڑی دیر بعد ساوتری اور رکشا ایک بنچ پر بیٹھی باتیں کر رہی تھیں رکشا نے عقیدتمندانہ انداز سے ساوتری کی طرف دیکھ کر کہا بہن تم نے مجھے بچا لیا ورنہ پتہ نہیں کیا ہو جاتا، میں کانپ رہی تھی، مگر تمہاری آواز سنتے ہی میرا فکر مٹ گیا، مجھے یقین ہو گیا کہ اب مجھے کوئی خطرہ نہیں ۔

ساوتری "اور جو میں بھی تمہاری ہی جیسی ہوتی تو؟"
رکشا "مگر جس وقت تم نے جوتے لگانے شروع کئے اس وقت تو مجھے مزہ آگیا، ایک مرتبہ تو میرے دل میں بھی گدگدی ہوئی کہ بڑھ کر ایک لگا دوں"۔

ساوتری "(حیرت سے) "ارے! تمہارے، تمہارے دل میں!"
رکشا "لیکن تم یہاں کیسے آگئیں میں تو سمجھتی تھی تم لاہور پہنچ چکی ہوگی"۔
ساوتری "تم نے مجھے یاد کیا تھا یا نہیں"۔
رکشا۔ (شرما کر) "کیا تھا"۔
ساوتری "(لگا کر) بس بس اسی وقت اُڑ کر یہاں پہنچ گئی، تم سے آج ہی تو عہد کیا تھا کہ جب بھگتی سے بلاؤ گی اُسی وقت پہنچ جاؤنگی"۔
رکشا "نہیں سچ بتاؤ"۔
ساوتری "تمہارے آنے کے بعد یہاں کی ایک سہیلی مل گئی، اپنی بھابی کو وداع کرنے آئی تھی، مجھے دیکھ کر لپٹ گئی، بتیرا انکار کیا لیکن اُس نے ایک نہ سُنی، کہا اس وقت کبھی نہ جانے دونگی شام کی گاڑی سے چلی جانا، مجبوراً اُترنا پڑا۔ اب انہیں تار دیدیا ہے کہ رات کی گاڑی سے آرہی ہوں سٹیشن پر چلے آنا"۔
رکشا "اب اکیلی جاؤ گی، بہن تمہیں نمسکار ہے"۔

ساوتری: "تم ساتھ چلی چلو، اُن کے حوالے کر کے لوٹ آنا"۔
رکشا: "میں کیا جاؤں گی (تھوڑی دیر ٹھہر کر) پرماتما نے تمہاری سہیلی کو میرے ہی لئے سٹیشن پر بھیج دیا تھا، مل جائے تو پاؤں چوم لوں"۔
ساوتری: "اور میرے ہاتھ نہیں چومتی جنہوں نے اس کی مرمت کی ہے"۔
رکشا (ساوتری کے ہاتھ دبا کر) "بہن تمہارا تو میرے جسم کا ایک ایک رواں رواں شکر گزار ہے۔ جب تک جیتی ہوں یہ احسان نہ بھولوں گی، تم نے میری جان بچالی (آہ سرد بھر کر) کتنا بھیانک وقت تھا، اب بھی خیال آتا ہے تو کلیجہ کانپ اُٹھتا ہے اس وقت تمہارے رُوپ میں خود بھگوان آگئے۔ دروپدی کو کرشن نے بچایا تھا مجھے تم نے بچا لیا"۔
ساوتری: "اب کسی سے چھیڑ چھاڑ نہ کرے گا"۔
رکشا: "بہن! تمہارا حوصلہ دیکھ کر میں دنگ رہ گئی، تم اُسے ڈانٹتی تھی میں عش عش کرتی تھی کہ ایک میں ہوں جو بھیگی بلی بن کر کھڑی کانپ رہی ہوں، ایک یہ ہے جو شیر کی طرح گرج رہی ہے"۔
ساوتری: "لیکن یہ ہوا کیا۔ بہنوئی جی تمہیں چھوڑ کر کدھر چلے گئے"۔
رکشا۔ (فکرمند ہو کر) "یہ میں خود نہیں جانتی جب گاڑی آئی ہے تو میرے

آگے آگے چل رہے تھے، اس کے بعد پرماتما جانے کدھر غائب ہو گئے"۔

ساوتری تھوڑی دیر سوچتی رہی، اس کے بعد بولی، "میں سمجھ گئی اُنھوں نے غلطی سے کسی دوسری عورت کو اپنی سمجھ لیا ہے۔ اس کے کپڑے بھی تمھاری طرح ہونگے۔ ممکن ہے اُس کا بھی گوتا ابھی ہوا ہو، مہندی والے ہاتھ اور چوڑیاں والے بازو دیکھ کر مغالطہ لگ جانا کوئی تعجب کی بات نہیں۔ ایسے واقعات اکثر ہوتے رہتے ہیں۔ سیالکوٹ جاکر راز کھلے گا تو بھاگے ہوئے آئیں گے۔ شاید اسی گاڑی میں آجائیں"۔

رکشا۔ "اُن کو غلطی لگی، میری مُوت میں شُبہ نہ تھا"۔

ساوتری (مذاق سے) "ذرا گھونگھٹ اور لمبا کھینچ لو، کیوں اب بھی پردہ کو جواب دوگی یا ابھی کچھ اور دیکھنے کا ارادہ ہے"۔

رکشا نے مُنہ سے اس کا جواب نہ دیا لیکن اس کے دل میں ہلچل مچی ہوئی تھی سوچتی تھی کہتی تو ٹھیک ہے۔ اگر پردہ نہ ہوتا تو اس مصیبت کا امکان ہی نہ تھا ساتھ ساتھ چلی جاتی، اگر ساتھ نہ جاتی پیچھے پیچھے ہی جاتی جب بھی اُن کو مغالطہ نہ ہوتا۔ میں سمجھتی تھی پردہ نہ کرنے سے بیحیائی آجاتی ہے لیکن میرا یہ خیال غلط نکلا، البتہ اتنا ثابت ہو گیا کہ

پردہ جرأت کا قاتل ہے، جو پردہ کرے گی اُس میں جرأت نام کو بھی نہ ہوگی اور پھر پردے میں اور بھی سینکڑوں عیوب بھرے ہیں، دو دلیل کا سفر ہو مرد ساتھ جائے، ایک ساوتری ہے کہ تن تنہا سفر کرتی ہے اور پھر اتنی دلیری سے کہ کیا مجال جو کوئی آنکھ بھی اُٹھا جائے۔ لیکن پھر خیال آتا لوگ کیا کہیں گے، یہی کہ بے حیا ہو گئی ہے، کیسا مُنہ کھول کر چلتی ہے، شرم نام کو نہیں، عورتیں الگ طعنے ماریں گی، ہائے دُنیا کی زبان، ہائے لوگوں کی شرم۔

آدھ گھنٹے کے بعد سیالکوٹ سے گاڑی آئی تو اُس میں رکشا کا خاوند بھی تھا، بیچارہ گھبرایا ہوا تھا، مُنہ پر وہ رونق ہی نہ تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے راہ میں روتا رہا ہے۔ گاڑی سے اُترتے ہی اِدھر اُدھر تلاش کرنے لگا۔ ساوتری نے اُسے دیکھتے ہی پہچان لیا، اور اشارہ سے اپنے پاس بُلا کر پُوچھا "کیوں آپ کی کوئی چیز کھو گئی ہے؟"

راجی داس "جی ہاں! کیا کہوں میری آنکھیں......"

یہ کہہ کر اُنہوں نے رکشا کی طرف دیکھا جو سمٹی سمٹائی بنچ پر بیٹھی تھی۔

ساوتری "ہاں ہاں کہئے، آپ رُک کیوں گئے؟"

مسٹر راجی داس نے جواب نہ دیا چُپ چاپ رکشا کی طرف دیکھنے لگے اور سوچنے لگے یہی تو نہیں ہے۔

ساوتری نے تیوڑی چڑھا کر کہا "آپ اُدھر کیا دیکھتے ہیں، شرم نہیں آتی، پردہ نشین عورت ہے، اُس کی طرف گھور گھور کر دیکھ رہے ہیں، بلاؤں کسی پولیس کے آدمی کو؟"

راجی داس کا چہرہ اُتر گیا، بھرّائی ہوئی آواز میں بولے "میری بیوی کھو گئی ہے۔ اُس کے بھی ایسے ہی کپڑے تھے، اِسی طرح کی تھی" یہ کہتے کہتے اُن کی آنکھیں آبگوں ہو گئیں"۔

ساوتری نے مُسکرا کر کہا "ارے! بیوی کھو گئی ہے، بڑے مزے کی بات ہے۔ اِدھر اس غریب کا بھی خاوند کھو گیا ہے۔ آپ سیالکوٹ سے آ رہے ہیں؟ ہاں وہیں سے تو آ رہے ہیں، دیکھیں تو پہچان لیں یا نہیں؟"

راجی داس کی آنکھیں پھر چمکنے لگیں، ذرا ہچکچا کر بولے "اسے تو کیا پہچانوں گا البتہ کپڑے پہچان سکتا ہوں، ٹھیک ایسے ہی تھے۔ میرا خیال ہے یہی تھے"۔

ساوتری "عجیب ماجرا ہے، نہ خاوند بیوی کو پہچان سکتا ہے، نہ بیوی شوہر کو پہچان سکتی ہے"۔

راجی داس کو اب اَور بھی اُمید ہو گئی، مجھے بیوی مل گئی، اطمینان کا سانس لے کر بولے "سیالکوٹ سے یہاں تک جیسے آیا ہوں، پرماتما ہی

جانتا ہے، اب اطمینان ہُوا"۔

ساوتری :- مگر یہ کیسے معلوم ہُوا کہ یہ آپ ہی کی بیوی ہے، کسی اَور کی نہیں ؟"

رانجی داس :- بہن جی! اب مذاق نہ کیجئے، کافی پریشان ہو چکا ہوں دل ابھی تک دھڑک رہا ہے"۔

ساوتری :- اور جس وقت اِس غریب کو چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ اُس وقت اِس کا دِل تو خوشی سے ناچنے لگا ہو گا، نہال ہو گئی ہو گی ؟"

رانجی داس :- اب کیا کہوں، بھیڑ میں جا رہا تھا کہ اتنے میں دیکھا ایک عورت زنانہ ڈبے میں سوار ہو رہی ہے، اتنی ہی عُمر تھی، ایسے ہی کپڑے تھے، مَیں سمجھا یہی ہے۔ بے فکر ہو کر ساتھ کے کمرے میں بیٹھ گیا، سیالکوٹ پہنچا تو راز کُھلا"۔

ساوتری :- جائیے بھاگ کر مٹھائی لائیے۔ مُنہ میٹھا کئے بغیر بیوی نہ دونگی۔ مگر سیالکوٹ تک لے جا سکیں گے آپ اِسے ؟

رانجی داس :- کیوں ؟"

ساوتری :- کہیں راہ میں پھر نہ کھو دیں، مجھے یہی اندیشہ ہے، کہئے تو ساتھ چل کر پہنچا آؤں"۔

رانجی داس :- اب اَور شرمندہ نہ کیجئے، یہ سبق عُمر بھر نہ بھُولے گا"۔

اس کے بعد ساوتری نے رانجی داس سے تمام واقعہ بیان کیا رانجی داس اس کی ہمّت پر عش عش کرنے لگے، بولے آپ کے احسان سے میری گردن نہ اُٹھے گی۔ ایسی ہمّت عورتوں کی ہو جائے تو ہمارا بیڑا پار ہو جائے۔ ہمیں ذرا تکلیف نہ ہو"۔

ساوتری "یہ سب آپ ہی لوگوں کے ہاتھ میں ہے، چاہیں تو عورتیں آج شیر ہو جائیں۔ اب میری گاڑی کا بھی وقت ہو گیا ہے جاتی ہوں پھر ملیں گے تو باتیں ہونگی"۔

رانجی داس (اشتیاق سے) "آپ اپنا پتہ تو دیتی جائیں، اور نہیں شکریہ کا خط تو بھائی صاحب کو لکھ دوں"۔

ساوتری "پتہ رکشا سے پُوچھ لینا، میں نے بتا دیا ہے۔ باقی رہا شکریے کا خط، بھائی صاحب اس کے بھوکے نہیں، وکیل ہیں، اُن کو تو اپنی فیس سے غرض ہے۔ اتنا بھاری کام کیا ہے فیس کبھی نہ چھوڑیں گے"۔

یہ کہہ کر ساوتری نے رکشا سے اجازت لی، اور اُسے پیار کر کے رخصت ہوئی۔ رانجی داس نے پکار کر کہا "جب آپ کو پیا کوٹ آنا ہو تو خط لکھ دیجئے گا سٹیشن پر آ جاؤنگا، یا اگر میں نہ آیا تو کوئی اور آ جائیگا"۔

ساوتری نے مسکرا کر پیچھے دیکھا اور جواب دیا "بہت اچھا

لکھ دیں گے"۔

(۴)

کئی ماہ بعد دونوں سکھیوں کا گاڑی ہی میں پھر ملاپ ہوا۔ مگر اسوقت رکشا وہ رکشا نہ تھی۔ معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی آزاد قوم کی آزاد عورت چلی آرہی ہے۔ وہ گھونگٹ وہ پردہ نام کو بھی نہ تھا۔ اس کے پیچھے پیچھے قلی اسباب لئے آرہے تھے۔ وہ بھی اسی ڈبہ کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی جس میں ساوتری بیٹھی اپنے میکے جا رہی تھی۔ رکشا نے قلیوں سے کہا اسباب رکھ دو، رکھ چکے تو اُن کو گن کر مزدوری دی، اور اطمینان و سکون سے گاڑی میں بیٹھ گئی۔ ساوتری نے یہ تمام نظارہ بیٹھے بیٹھے دیکھا تو اس کا چہرہ شگفتہ ہو گیا۔ مسکرا کر بولی "واہ بہن! اب تو بڑی بہادر بن گئی"۔

رکشا نے چونک کر سر اُٹھایا تو سامنے ساوتری کھڑی ہنس رہی تھی، رکشا اُچھل کر اُس کے گلے سے لپٹ گئی اور بولی۔

"بہن! میں تو مایوس ہو چکی تھی، مجھے اُمید نہ تھی کہ تم سے ملاقات ہوگی تمہارے مکان پر دو مرتبہ گئی، دونوں مرتبہ معلوم ہوا لاہور سے باہر ہیں، آج جاتے ملاقات ہو گئی، دل خوش ہو گیا"۔

اتنے میں راجی داس ڈبہ کے سامنے آکر بولے "سب اسباب ٹھیک رکھا گیا؟"

رکشا نے مسکرا کر کہا "دیکھئے بہن جی مل گئیں، نمستے کر لیجئے، کیا معلوم کس سٹیشن پر اُتر کر چل دیں"۔

راجی داس نے جھک کر ساوتری کی طرف دیکھا، ہاتھ باندھ کر نمستے کی اور کہا "دو دفعہ گئے مگر کوئی نہ ملا"۔

اتنے میں گارڈ نے سیٹی دی، ساوتری نے نمستے کا جواب دے کر کہا "اچھا اب جا کر بیٹھ جائیے نہیں گاڑی چھوٹ جائیگی"۔

راجی داس چلے گئے گاڑی چلنے لگی۔

ساوتری نے پوچھا، "رکشا وہ گھونگٹ کہاں ہے؟"

رکشا نے مسکرا کر جواب دیا، "وزیرآباد کے اسٹیشن پر چھوڑ دیا اُسی دن"۔

ساوتری "لوگ دیکھ کر ہنستے ہونگے"۔

رکشا "شوق سے ہنسیں، اس سے اپنا بگڑتا ہی کیا ہے"۔

ساوتری "عورتیں کہتی ہونگی، کیسی بے شرم ہے، کھلے منہ چلتی ہے"۔

رکشا "اُس محتاجی سے یہ بے شرمی اچھی۔ اب قدم قدم پر ذلیل تو نہیں ہونا پڑتا، ابھی چلے آرہے تھے، پل پر اُن کے ایک پرانے دوست مل گئے، کئی سال کے بعد ملے تھے، وہ باتیں کرنے کھڑے ہو گئے، پردہ ہوتا تو میں بھی ان سے چار قدم کے فاصلے پر گھونگٹ نکال کر کھڑی رہتی جیسے قیدی ہتھکڑیاں ڈالے اپنے جمعدار کا انتظار کر رہا ہو"۔

رکشا:- "مگر یہ کایا پلٹ کیسے ہوئی؟ کہاں وہ پاڑیل! کہاں یہ چہکنے والی چڑیا زمین آسمان کا فرق پڑ گیا"۔

رکشا:- "بڑی لمبی کہانی ہے بہن! (ٹھنڈی آہ کھینچ کر) یہ آزادی کی ہوا بڑی مہنگی ملی ہے، ایسی ایسی تکلیفیں آئیں کہ تم سے کیا کہوں، مگر آفریں ہے اُن پر، ذرا نہ گھبرائے۔ اگر کوئی اور ہوتا تو ضرور ہمت ہار دیتا"۔

ساوتری کی آتشِ شوق اور بھی تیز ہوئی، پاس کھسک کر بولی، "اس طرح نہیں۔ پوری تفصیل سے سنا"۔

سامنے دو عورتیں بیٹھی تھیں، اُنہوں نے بھی جھک کر اپنی ٹھوڈیاں ہاتھوں کی ہتھیلیوں پر رکھ لیں اور سننے لگیں۔

رکشا نے کہا، "بہن! سیالکوٹ جا کر اُنہوں نے گھر والوں سے صاف کہہ دیا کہ میں تو پردہ نہ کراؤں گا، گھر والے سناٹے میں آ گئے، اُن کو کبھی شبہ بھی نہ ہوا تھا کہ لڑکا یوں ہاتھ سے نکل جائیگا، کئی دن تک سمجھاتے رہے مگر ان پر ذرا اثر نہ ہوا بولے میں آپ کی ہر ایک بات مانوں گا، مگر اس معاملہ میں ایک نہ سنوں گا"۔

دو دن یہ بحث ہوتی رہی، تیسرے دن صبح کے وقت مجھے سیر کو باہر لے گئے، جب ہم واپس آئے تو سبھی کے منہ ٹیڑھے تھے، کوئی سیدھے منہ بات بھی نہ کرتا تھا۔ ساس نے مجھے سنا کر کہا، "چلو اور نہیں

میم تو بن گئی ہے، سایہ پہن لے تو رہی سہی کسر پوری ہو جائے۔ لاہور جا کر یہی باتیں سیکھتا رہا ہے"۔

بھابی نے جواب دیا "راج کا اس میں ذرا بھی قصور نہیں، یہ سب ہماری بہو ہی کی کرتوت ہے، چاہتی ہے کسی طرح الگ ہو جاؤں، مگر کتنی چالاک ہے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں بولتی، آگ لگاتی پھرتی ہے"۔

ساس "نہیں بیٹی! راج ہی بگڑ گیا ہے، اس کا قصور نہیں، اس کا کیا ہے جو کہے گا کرے گی"۔

بھابی "بہو چاہے تو راج کی ایک بھی پیش نہ جائے، منہ دیکھتا ہی رہ جائے کہے بھئی میں تو پردہ کروں گی، جھگڑا ختم، مگر نہیں ہمارے سامنے من من کرتی ہے، تنہائی میں آگ پر تیل چھڑکتی ہے"۔

ساس نے کہا، یہ تو ٹھیک ہے، وہ سیر کرنے نہ جاتی تو وہ کیسے لے جاتا جھٹ جوتا پہن کر طیار ہو گئی"۔

اس کے بعد بہن جو مجھ پر بیتی ہے وہ میں ہی جانتی ہوں، سارا گھر برخلاف تھا حق میں کوئی بھی نہ تھا، کوئی اتنا بھی نہ پوچھتا تھا کہ غریب نے کھانا بھی کھایا ہے یا نہیں، ہاں باتیں کرنے کو سب تیار تھے۔ میں سارے سارے دن روتی رہتی تھی کہ کہاں آ پھنسی، اسی طرح کوئی پندرہ دن گزر گئے۔

شام کا وقت تھا، آسمان پر بادل گھرے ہوئے تھے، سُسر جی باہر سے آتے ہی بولے "یہ تم کدھر ہو"۔ ساس جی کمرے میں بھابی کی لڑکی کو کنگھی کر رہی تھیں، آواز سُنتے ہی باہر نکل کر بولیں "کیوں کیا ہے؟ بڑے غصہ میں معلوم ہوتے ہو"۔

سُسر "غصہ میں نہ ہوں تو کیا کروں، اِس لڑکے نے تو جینا حرام کر دیا، سارا بازار کھلّی اُڑاتا ہے، مجھے دیکھتے ہیں تو سُنا سُنا کر باتیں کرتے ہیں تُم سے کیا کہوں، کبھی کبھی تو جی میں آتا ہے زہر کھالوں"۔

ساس "زہر کھائیں تمہارے دُشمن، تم ذرا ڈانٹ کیوں نہیں دیتے، ایک بار کہہ دو تو پھر کوئی بات بھی نہ کرے"۔

سُسر "اب کس کس سے لڑوں، سارا بازار ہی ہنستا ہے، آج تو مَیں اس کا فیصلہ ہی کر دینا چاہتا ہوں، یا اِدھر یا اُدھر۔ راج گھر میں ہے یا کہیں باہر گیا ہے؟"

ساس "باہر گیا ہے۔ آتا ہی ہو گا، ذرا اطمینان سے بات چیت کرنا تو تمہاری عادت ہے لاٹھی دے مارتے ہو"۔

سُسر (تیوری چڑھا کر) "بس مَیں نے بات کی اور تمہیں زہر چڑھا تُم سے تو چھوٹی بہو اچھی ہے، راج غلطی پر ہو یا راستی پر وہ اسی کا کہنا مانے گی، ایک تُم ہو کہ سر کے بال سفید ہو گئے مگر اتنی بھی

عقل نہ آئی"۔

ساس :- اب عقل اس جنم میں تو آتی نہیں، دُوسرے جنم میں دیکھا جائیگا۔
اتنے میں وہ بھی آ گئے، مَیں ڈر گئی۔ سُسر جی نے اُنہیں دیکھتے ہی
کہا :- سُنو بھئی! میرے گھر میں بے حیائی نہ چلے گی، یا پردہ کرو یا گھر سے
نکلو، بولو کیا منظور ہے؟"

وہ باہر سے آئے تھے، آتے ہی غصّہ کی باتیں سُن کر گھبرا گئے۔ تھوڑی دیر
کے بعد بولے :۔

"اب یہ پردہ اتنا پیارا ہو گیا؟"

سُسر :- اس سے بھی پیارا"۔

وہ :- اس کے سامنے لڑکا بھی کوئی چیز نہیں"۔

سُسر :- لڑکا تو ایک طرف رہا، مَیں اس کے سامنے جان کی بھی حقیقت
نہیں سمجھتا، تم اسے پردہ کہتے ہو، مَیں اسے عزّت خیال کرتا ہوں"۔

وہ :- بہت اچھّا، مَیں گھر چھوڑ دوں گا اپنی بات نہ چھوڑوں گا"۔

مجھے ایسا معلوم ہُوا جیسے کسی نے سینہ میں گھونسا مار دیا ہو، حیران
تھی کہ اب کیا ہونے والا ہے۔

ساس بولیں، باپ کے سامنے یُوں بولتے شرم تو نہ آتی ہو گی، یہ
نہیں کہتا کہ جیسا آپ کہتے ہیں ویسا ہی کروں گا۔ ماں باپ کے ہوتے

ہوئے بیوی کے متعلق تجھے منہ بھی نہ کھولنا چاہیئے۔ بیاہ ساری دُنیا کا ہوتا ہے مگر تجھ جیسا بے شرم تو کوئی نہیں دیکھا"۔

سُسر (غصہ سے) "تو تمہارا یہی فیصلہ ہے، دیکھو پچھتاؤ گے، اسوقت سوچ لو"۔

وہ۔ (استقلال کے لہجہ میں) "جو سوچنا تھا سوچ چکا"۔

سُسر۔ "بہت اچھا، اب آپ تشریف لے جائیے، اپنی بیوی کو بھی لے جائیے، میرے لئے تم مر گئے تمہارے لئے میں مر گیا۔ بس"۔

یہ کہتے کہتے سُسر جی اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلے گئے، ساس جی رونے لگیں، اُنہوں نے بیٹے کو بہت سمجھایا، مگر اُنہوں نے ایک نہ سُنی دیکھتے دیکھتے وہ طیار ہو گئے، اُنہوں نے گھر کی کوئی چیز بھی ساتھ نہ لی، یہاں تک کہ جہیز کا تمام سامان بھی وہیں چھوڑ دیا، مجھ سے بولے "چلو!" میں چُپ چاپ کھڑی ہو گئی۔

اُنہوں نے ماں سے کہا، "دیکھ لو میں سب کچھ یہیں چھوڑے جاتا ہوں"۔

ماں نے جواب میں صرف آہ سرد بھری، اور سر جھکا لیا، مگر بھابی چمک کر بولی "کیسے چھوڑے جاتے ہو۔ بیوی تو گوندنی کی طرح لدی ہوئی ہے"۔

یہ بات مجھے ایسی بُری معلوم ہوئی جیسے کسی زخم پر نشتر لگ جائے مگر منہ سے کچھ نہ کہا یہاں تک کہ آہ بھی نہ نکلنے دی۔

وہ بولے "یہ زیور بھی اُتار دو۔ اِس ڈائن کا کلیجہ ٹھنڈا ہو جائے"۔

مَیں چُپ چاپ زیور اُتارنے لگی۔ ساس نے روتے روتے کہا، "بیٹی! رہنے دے، اری کیا کرتی ہے، یہ تو پاگل ہو گیا ہے"۔

مگر اُنہوں نے کہا "اُتار دے۔ پرماتما دے گا تو پہن لیں گے نہ دے گا۔ نہیں پہنیں گے"۔

مَیں نے زیور اُتار دیا، اور اُن کے پیچھے پیچھے باہر نکل آئی۔ ساس جی روتی ہی رہ گئیں۔ ہم چلے آئے۔ گلی کے موڑ پر پہنچے تو آسمان بھی رونے لگا، مَیں نے ٹھٹک کر کہا، "پانی برس رہا ہے"۔

وہ قدرے آزردہ ہو کر بولے "تُم کاغذ کی تصویر نہیں ہو کہ گل جاؤ گی چُپ چاپ چلی آؤ"۔

رات کا وقت تھا، بادل برس رہا تھا، زناٹے کی ہوا چل رہی تھی، اور ہم دونوں خاوند بیوی گھر سے نکل کر بارش میں بھیگتے سردی میں کانپتے سٹیشن کی طرف جا رہے تھے۔

(۵)

اتنا کہہ کر کشا چُپ ہو گئی۔ ساوتری نے اُس کی طرف نگاہِ تحسین سے

دیکھ کر کہا۔ بہن! تم دونوں نے بڑی ہمّت کی، مَیں بہنوئی جی کو ایسا نہ سمجھتی تھی۔ میرا خیال تھا سیدھے سادے آدمی ہیں، باپ نے ایک گھُرکی دی تو بیٹھ جائیں گے۔ مگر میرا خیال غلط نکلا، آنتے ہیں تو شاباش دیتی ہوں۔" اس کے بعد دیر تک کوئی بھی نہ بولا۔ آخر ساوتری نے مُہرِ سکوت توڑی اور پوچھا" اب کدھر جا رہے ہو؟"

رکشا۔ راولپنڈی تبدیلی ہوگئی ہے وہیں جا رہے ہیں۔"

اتنے میں وزیر آباد کا سٹیشن آگیا۔ گاڑی کھڑی ہوتے ہی رکشا، ساوتری کا ہاتھ تھام کر نیچے اُتری اور بولی" ذرا اِدھر آؤ۔"

ساوتری نے ذرا بھی عُذر نہ کیا، چُپ چاپ اُس کے ساتھ چلی گئی یہاں تک کہ دونوں سیالکوٹ کے پلیٹ فارم پر جا کر اس دیوار کے سامنے کھڑی ہوگئیں جہاں دو مہینے پیشتر رکشا سراسیمگی کی حالت میں کھڑی تھی۔ اُس وقت یہ جگہ کتنی بھیانک تھی، مگر آج اِس کے لئے وہ دیوار مندر سے کم نہ تھی، اسے معلوم ہوا جیسے وہ دیوار مُسکرا رہی ہے، جیسے اس سے باتیں کر رہی ہے۔ یہاں آکر اُسے جنّت کی بادشاہت مِل گئی رکشا نے ساوتری سے کہا" بہن یہ وہ جگہ ہے جس نے میری کایا پلٹ کی۔ یہیں پر میرے بندھن کھُلے، یہیں پر مجھے آزادی کی سانس لینے کا بردان مِلا، یہ جگہ میرے لئے مندر سے بھی بڑھ کر ہے۔"

یہ کہتے کہتے اُس کا گلا بھر آیا۔ اتنے میں ساوتری نے ایک بابو کی طرف اشارہ کر کے کہا "وہ دیکھو کون ہے، کچھ جانتی ہو؟"

رکشا:۔ "نہیں"۔

ساوتری (مُسکرا کر) "تمہارے مندر کا دیوتا ہے، وہی بابو جس کی اُس دن میں نے جُوتوں سے پُوجا کی تھی۔ ارے اتنی جلدی بھول گئیں، اسے بھی پرنام کرو"۔

بابو نے اِن دونوں کو دیکھا تو اِس طرح چونکا جیسے کوئی مقروض اپنے قرض خواہ کو دیکھ کر چونک اُٹھے۔ رکشا کے اُدھر دیکھنے سے پہلے ہی وہ اُلٹے پاؤں واپس چلا گیا۔ ساوتری نے زور سے قہقہہ لگایا۔

رکشا نے کہا "بہن! اُسے تو کیا پرنام کروں گی، ہاں جب تک جیوں گی تجھے ہمیشہ پرنام کرتی رہوں گی، میرے مندر کی دیوی تو ہے"۔

یہ کہتے کہتے رکشا نے محبّت بھری نگاہوں سے ساوتری کی طرف دیکھا اور پھر عقیدت سے سر جھکا لیا۔

تھوڑی دیر بعد دونوں گاڑی میں جا بیٹھیں، انجن نے سیٹی دی اور گاڑی آہستہ آہستہ چلنے لگی۔

بچپن کا ایک واقعہ

افسوس عہدِ بچپن کے وہ ہرے بھرے گلزار کہاں چلے گئے، وہ زندگی وہ زندہ دلی، وہ بے فکری، وہ کھیل کود کا پُربہار زمانہ آج بھی یاد آتا ہے تو دل میں ایک ہوک سی اُٹھنے لگتی ہے۔ کیسے عجیب دن تھے جو اتنی جلدی بیت گئے۔ کبھی کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ابھی کل ہی کا واقعہ ہے، اتنے سال گزر گئے، دُنیا کہیں سے کہیں جا پہنچی، لیکن وہ ہا تھ نہ آنے والا زمانہ ابھی تک آنکھوں کے سامنے پھر رہا ہے۔ وہ میلا جُزدان وہ سیاہی کے داغوں سے بھری ہوئی موٹے موٹے حرفوں والی کاپیاں، شیشے کی رنگدار گولیاں، وہ عہدِ طفلی کے پاک نفس دوست کیا ایسی چیزیں ہیں کہ اِس زندگی میں فراموش ہو سکیں اس زمانہ میں ایک پیسہ لے کر جو مسرت حاصل ہوتی تھی وہ آج سیکڑوں اور ہزاروں روپے لے کر بھی نہیں حاصل ہوتی۔ اُس وقت ایک ربڑ کی معمولی گیند میں جو خوشیاں

پنہاں تھیں وہ آج بڑے سے بڑے عہدے میں بھی نظر نہیں آتیں، وُہ دُنیا ہی نہیں رہی +

ہم دو بھائی تھے، مَیں اور وشنو، ایک بہن تھی۔ مَیں اُن سب میں چھوٹا تھا، اِس لئے ماں باپ مجھے سب سے زیادہ پیار کرتے تھے خصوصاً میری والدہ تو مجھ پر جی جان سے فدا تھی۔ ناممکن تھا کہ مَیں کوئی شے طلب کروں اور وہ مجھے مہیّا نہ کردی جائے گھر میں پھل یا مٹھائیاں آتیں توسب سے زیادہ حصّہ مجھے ملتا نئے کپڑے سلواتے وقت سب سے زیادہ کپڑے میرے لئے بنتے تھے۔ یہ ترجیحی سلوک میرے بہن بھائی کے لئے ناقابل برداشت تھا، وہ اِس پر کبھی کبھی جھنجھلا بھی اُٹھتے تھے کبھی کبھی رُوٹھ بھی جاتے تھے، لیکن اِس سے میرا کچھ بگڑتا نہ تھا۔ میری ماں ہمیشہ میری طرفداری کیا کرتی تھی۔ وائے حسرت! وہ پیار اور محبّت کی جیتی جاگتی مُورت آج اِس فانی دُنیا میں کہیں نظر نہیں آتی لیکن اُس کا رانیوں کی طرح مُسکراتا ہُوا وہ گول پاکیزہ پیارا چہرہ میرے آئینہ دل میں اب بھی اُسی طرح نقش ہے۔ میرے والدصاحب شملہ میں مُلازم تھے، اِس لئے وہ وہیں رہتے تھے، لیکن ماں کی محبّت باپ کے پیار کی کمی کو بطریق احسن پُورا کردیتی تھی، آج معلوم ہوتا ہے کہ ماں کا وجود دُنیا میں کیسی بیش قیمت کیسی شیریں چیز ہے +

مجھے وہ دن کل کی طرح یاد ہے، جب میری ماں کسی ضروری کام سے کہیں باہر گئی اور میرے رونے چلّانے کے باوجود مجھے بہن کے پاس چھوڑ گئی۔ یہ پہلا موقعہ تھا جب میری ماں نے میرے ساتھ اس نوع کی بے انصافی کی، روانگی کے وقت جب اس نے میرے سر پر ہاتھ پھیرنے کی غرض سے مجھے پچکار کر اپنے پاس بُلایا تو مَیں آنکھوں میں آنسو بھر کر ایک کونے میں جا چھپا اور غصّہ سے بولا "اب ہم تمہارے ساتھ کبھی نہ بولیں گے۔ جب واپس آؤ گی جب بھی نہ بولیں گے"۔

اُس کے چہرے پر ایک ہلکا سا تبسّم آگیا، اُس نے میری طرف ماں کی پیار بھری نگاہوں سے دیکھا اور میرے لئے چار پیسے میری بہن کو دے کر باہر چلی گئی۔ مَیں اُسی جگہ کھڑا رہا جب تک وہ نظر آتی رہی مَیں چُپ چاپ اُس کی طرف گھور گھور کر دیکھتا رہا، لیکن اُس کے کمرہ سے باہر نکلتے ہی میرا دل بے قابو ہو گیا، مَیں چیخ مار کر دیوانہ وار دروازہ کی طرف دوڑا، اِس طرح جس طرح بچھڑا گائے کی طرف لپکتا ہے۔ لیکن بہن نے میرے ہاتھ پکڑ لئے، مَیں نے اُس کی گرفت سے نکلنے کی بہت کوشش کی، اُس کا مُنہ نوچ لیا، اُس کے ہاتھ کاٹ کھائے۔ لیکن بہن نے نہ چھوڑا، مَیں رسٹ پٹا کر رہ گیا۔

مَیں اُداس رہنے لگا۔ اُس وقت میری عُمر بارہ سال کے لگ بھگ

ہو گئی میں اس سے پہلے کبھی ماں سے جُدا نہ ہوا تھا، نہ میں نے کبھی سوچا تھا کہ ماں مجھے بہن کے پاس چھوڑ کر اتنی دور چلی جائیگی، میرے دل میں کچھ کچھ ہونے لگا، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے گھر میں بالکل تنہا رہ گیا ہوں، جیسے اب ماں کبھی واپس نہ آئے گی جیسے چاروں طرف اندھیرا ہو گیا ہے۔

بڑا بھائی وشنو اپنے کھیل کود میں مست رہتا، لیکن بہن میری دلجوئی کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرتی تھی، جو پیسے اُسے اپنے لئے ملتے تھے وہ بھی مجھے کھلا دیتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کسی طرح میں اُداس نہ ہوں، مجھے ہنستے کھیلتے دیکھ کر اُس کی آنکھیں چمکنے لگتی تھیں۔ سکول سے آنے کا وقت ہوتا تو وہ دروازہ میں کھڑی ہو کر میرا انتظار کرتی رہتی تھی، مجھے دیکھتی تو آ کر میری کتابیں پکڑ لیتی، اور کہتی میں تیری ہی راہ دیکھ رہی تھی، چل منہ ہاتھ دھو کر کھانا کھا لے، رات کو وہ ٹین کے دیئے سے ڈیوڑھی دیکھتی اور دروازہ بند کر کے ہم کو اندر لے جاتی، مجھے اپنے ساتھ سُلاتی اور جب تک ہمیں نیند نہ آ جاتی تب تک پھول شہزادہ کی، سنہری ندی کی، پریوں اور دیووں کی دلچسپ کہانیاں سُناتی رہتی تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ماں کی غیر حاضری میں اُس کا تمام پیار بہن نے لے لیا تھا، وہی ایثار، وہی محبت، وہی جذبہ،

بعض وقت شبہ ہوتا تھا کہ یہ بھن نہیں حال ہے۔

اِسی طرح پانچ دن امن وامان سے گزر گئے۔ چھٹے دن جب میں سکول جانے لگا تو طاق پر ایک روپیہ پڑا دیکھا، خوشی سے میرا دل دھڑکنے لگا۔ اگر یہ روپیہ میرے ہاتھ لگ جائے تو جماعت بھر میں سب سے امیر بن جاؤں، جس کو دکھاؤں وہی دنگ رہ جائے پیپرمنٹ کی ٹکیاں، اور کھٹی میٹھی انگریزی گولیاں خرید لوں اور سب کو دکھا دکھا کر کھاؤں۔ وہ تمام چیزیں جب بھی نہ دوں ایک ربڑ لے لوں، ایک شیشے کی چور دوات، بہت سی کتابیں پر چپکانے والی تصویریں اور ایک شاندار گیند، جو دیکھے وہی تعریف کرے۔

معاً خیال آیا کہ اگر چوری پکڑی گئی تو پھر کیا ہوگا، پٹ جاؤں گا، ایسی بے بھاؤ کی پڑیں گی کہ کھایا پیا سب نکل جائیگا، میں نے روپیہ کی طرف سے آنکھیں ہٹالیں اور باہر جانے کو تیار ہوا، لیکن آنکھیں پھر اُدھر ہی دیکھنے لگیں۔ پیپرمنٹ کی ٹکیاں، کھٹی میٹھی گولیاں ربڑ شیشے کی دوات سب چیزیں سامنے آکر کھڑی ہو گئیں، اُٹھتے ہوئے پاؤں پھر رُک گئے۔ سوچا مجھے کوئی دیکھتا تھوڑا ہی ہے، اگر کوئی پوچھے گا تو صاف کہدیں گے ہمیں کیا معلوم، ہم سے قسم لے لو، ہم نے دیکھا بھی نہیں، ایک پیسہ ہر روز ملتا ہے وہی کھا لیتے ہیں ہمیں روپیہ

سے کیا سروکار؟

میں نے اِدھر اُدھر دیکھا، میدان صاف تھا، بہن باہر آنگن میں بیٹھی پُرانے کپڑے چھانٹ رہی تھی، وشنو جُزدان بغل میں دبائے گیند کو ہوا میں اُچھال اُچھال کر گونج رہا تھا اور میرے سامنے تنہائی میں سفید گول چمکدار روپیہ طاق پر پڑا تھا، میں نے ہاتھ بڑھایا اور روپیہ جیب میں رکھ کر باہر نکل آیا۔ اس وقت میرا دل بڑے زور سے دھڑک رہا تھا۔

مدرسہ پہنچا، تو میرا دماغ آسمان پر تھا ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے میں بادشاہ بن گیا ہوں، جیسے میں ہوا میں اُڑ رہا ہوں، پڑھنے میں کس مردُود کا جی لگتا تھا، جس کے پاس ایک دم روپیہ ہو، کیا کبھی وہ بھی پڑھ سکتا ہے۔ میں بار بار جیب ٹٹول کر دیکھتا تھا کہ روپیہ ہیں ہے نا کسی نے نکال تو نہیں لیا۔ آخر بڑی مشکل سے ایک بجا اور ہمیں آدھ گھنٹے کی چھٹی ہوئی۔ میں نے سب سے پہلے جاکر ایک آنے کی کھٹی میٹھی گولیاں خریدیں، ایک آنے کا ربڑ لیا، اور باقی پیسے جیب میں ڈال کر نہایت امیرانہ چال سے آہستہ آہستہ مدرسہ کی جانب چلا آیا۔ اُس وقت میرے پاؤں زمین پر نہ پڑتے تھے۔ گولیاں مُنہ میں ڈال کر چُوستا تھا اور سر اُٹھا اُٹھا کر دُوسرے لڑکوں کی طرف دیکھتا تھا، اور

کہتا تھا دیکھتے کیا ہو، ایک آنہ کی مٹھائی ہے، تم نے بہت کیا ایک پیسہ کی خرید لی، ہم نے ایک آنہ کی خریدی ہے۔ تھوڑی دیر میں میری امیری ساری جماعت میں مشہور ہوگئی۔ میرے پاس بیٹھنے کے لئے سب لڑکوں میں کشمکش ہونے لگی، ہر ایک لڑکا یہی چاہتا تھا کہ میرے پاس بیٹھے۔ جب چھٹی ہوئی تو تین لڑکے میرے ساتھ ہوگئے جانتے تھے کہ آج اس کے پاس بہت پیسے ہیں، کھائیگا اور کھلائیگا ؞

اب سوال یہ تھا کہ کیا کھائیں، بہت دیر بحث مباحثہ ہوتا رہا۔ آخر دہی بڑے کھانے کا فیصلہ ہُوا۔ ہم سب مل کر چار لڑکے تھے۔ چار چار پیسے کے دہی بڑے کھا گئے، چونی کا خون ہو گیا لیکن مجھے ذرا بھی پروا نہ تھی۔ ابھی کافی رقم باقی تھی۔ دہی بڑوں کی دُکان سے اُٹھ کر مَیں نے چار پیسے کی چُورن کی پُڑیاں لیں اور سب کو ایک ایک بانٹ دی، اس کے بعد ریوڑیاں خریدیں اور جیبیں بھر لیں، ذرا آگے بڑھے تو بسکٹوں کی دُکان نظر آئی۔ میرے پاؤں وہیں رُک گئے۔ شیشے کی دوات، کتابوں پر چپکانے کی تصویریں سب کا خیال جاتا رہا۔ مَیں نے چار آنے کے بسکٹ خرید لئے، اور تھوڑے تھوڑے اپنے ساتھیوں کو دے کر باقی خود کھانے لگا۔ اُن کی وہ سوندھی بُو آج بھی یاد آرہی ہے۔ اب وہی بسکٹ کئی دفعہ پھر کھائے ہیں لیکن وہ ذائقہ کہاں؟ وہ بات ہی

اور بھی، جتنے کھا سکتا تھا کھائے باقی کاغذ میں لپیٹ کر جزدان میں رکھ لئے۔ ربڑ، چورن، ریوڑیاں اور چند پیسے بچ گئے تھے وہ بھی لپیٹ کر وہیں رکھ لئے۔ اس سے بڑھ کر محفوظ جگہ میرے لئے اور کوئی نہ تھی۔ اتنے میں شام ہوگئی، خیال آیا آج بہت دیر ہوگئی ہے، میں نے اپنے لالچی دوستوں سے رخصت لی اور بھاگ کر گھر کی طرف چلا۔

بہن آج بھی دروازہ میں کھڑی میرا انتظار کر رہی تھی، مجھے دیکھتے ہی گلی میں چلی آئی اور پیار سے ڈانٹ کر بولی "آج کہاں بیٹھ رہا تھا تو، یہ بھی خیال نہیں کہ بہن راہ دیکھ رہی ہوگی"۔

میں پہلے ہی جانتا تھا کہ مجھ سے دیری کی وجہ پوچھی جائے گی اس کا جواب بھی میں نے سوچ رکھا تھا۔ فوراً کہا "چوک میں مداری کا تماشا ہو رہا تھا وہیں دیر ہوگئی، بڑا اچھا تماشا تھا"۔

یہ کہہ کر میں جلدی سے گھر میں چلا گیا، تاکہ کہیں بہن جزدان نہ دیکھ لے۔ جزدان اپنی جگہ رکھ کر میں صحن میں آیا تو بہن نے کہا "آ کھانا کھالے، بالکل ٹھنڈا ہوگیا ہے، دشمن تو کبھی کا کھا چکا"۔

لیکن بھوک ہی کہاں تھی، بولا "آج سارا دن پیٹ میں درد ہوتا رہا ہے۔ اس وقت ذرا بھی بھوک نہیں ہے"۔

بہن نے میرے پاس آکر میرا ہاتھ پکڑ لیا اور پیار سے بولی "کیوں

پیٹ میں درد کیوں ہوتا رہا ہے"۔

میں کیا جواب دیتا "پتہ نہیں" کے سوائے میرے پاس اور کوئی جواب نہ تھا۔

بہن "سونف کا عرق منگوا دوں، ابھی آرام ہو جائیگا، کیوں؟"

میں "نہیں، بہن جی، ہم عرق نہ پئیں گے، بڑا کڑوا ہوتا ہے"۔

بہن "مگر آرام تو ہو جائیگا اُس سے"۔

میں "ہمیں اب درد تھوڑا ہو رہا ہے؟ وہ تو سکول میں ہوتا تھا، اب بالکل آرام ہے، صرف بھوک نہیں ہے"۔

دشنو نے دُور ہی سے کہا، "بہن جی! جھوٹ بولتا ہے، لاؤ، پیسہ ابھی بھاگ کر لے آئیں۔ ورنہ رات کو چارپائی پر بیٹھ کر روئے گا پھر ہم سے کہو گی، جاتا کیوں نہیں، مگر ہم اندھیرے میں نہ جا سکیں گے، بے شک پڑا رویا کرے۔ اور کیا؟"

میں "نہ جانا تمہاری منتیں کون کرتا ہے۔ بڑے چلے ہیں رُعب کھانے"۔

دشنو "جب رات کو درد ہو گا، اُس وقت پوچھیں گے ہم"۔

میں "اور کیا تمہیں کبھی نہ ہو گا کیا، کبھی بخار بھی نہ چڑھے گا، اُس وقت ہم بھی تمہارے لئے دوا نہ لائیں گے"۔

بہن "مگر تم عرق پی کیوں نہیں لیتے، اُس میں چینی چھوڑ دوں تو ذرا بھی

کڑوا نہ لگے، ایک منٹ میں حلق سے نیچے اُتر جائیگا"۔

مگر مَیں نے کہا، "ہمیں ضرورت نہیں تو خواہ مخواہ کیوں پئیں"۔

بہن جی چُپ ہو گئیں، اور جا کر کھانا کھانے لگیں۔ اب مجھے اطمینان ہُوا کہ میری چوری کی طرف کسی کا دھیان ہی نہیں ہے، لیکن دُوسرے دن آنکھ کھُلتے ہی سُنا۔ بہن جی وشنو سے کہہ رہی ہیں، دیکھ وشنو! روپیہ سیدھے ہاتھ سے دیدے نہیں پِٹے گا"۔

وشنو "مگر مَیں نے روپیہ دیکھا ہی نہیں ہے۔ دے کہاں سے دُوں"۔

بہن "دیکھا نہیں تو کیا زمین نگل گئی"؟

وشنو۔ "مجھے کیا معلوم، ہری لے گیا ہوگا"۔

میرا کلیجہ دھڑکنے لگا، مگر مَیں کروٹ بدل کر چُپ چاپ لیٹا رہا، جیسے کوئی گہری نیند میں سو رہا ہو۔

بہن "ہری ایسی حرکت کبھی نہیں کر سکتا، مجھے اِس پر ذرا بھی شُبہ نہیں۔ ہو نہ ہو، یہ تمہاری ہی شرارت ہے۔ اب بھی لوٹا دو، تو کسی سے نہ کہوں گی۔ ورنہ یاد رکھ، ماں جی ابھی آتی ہونگی آتے ہی کہدوں گی"۔

وشنو "سَو دفعہ کہدینا، ہزار دفعہ کہہ دینا، جب ہم نے اُٹھایا نہیں تو ہمیں ڈر کاہے کا ہے"۔

بہن۔" پھر کس نے اُٹھایا ہے؟ بولو"۔
وشنو۔ ہری نے ریکایک چلّا کر اور آواز کو لمبا کرکے) "ہاں ہاں ہاں! جبھی کل رات میں بھوک نہیں تھی۔ (چٹکی بجا کر) اب سمجھا۔ جناب نے مٹھائیاں اُڑائی ہونگی، جلسے کئے ہونگے۔ اور کیا؟"
معلوم ہوتا ہے یہ سُن کر بہن جی کو بھی ہماری شرافت پر شُبہ ہوگیا تھوڑی دیر بعد وہ آکر میری چارپائی پر بیٹھ گئیں اور مجھے آہستہ سے ہلاکر بولیں "ہری"۔
مَیں چُپ چاپ پڑا رہا۔
بہن۔ (قدرے زور سے) "ہری"۔
مَیں اب بھی نہ بولا۔
بہن۔ (میرا کندھا ہلاکر اور بھی بلند آواز سے) "ہری!
مَیں آنکھیں ملتا ہُوا اُٹھ کر بیٹھ گیا، مگر بہن جی کے چہرے کی طرف دیکھنے کی مجھ میں ہمت نہ تھی۔
بہن۔" تم نے طاق سے ایک روپیہ تو نہیں اُٹھایا؟ کل ہی رکھا تھا"۔
میں (حیرت کا اظہار کرتے ہوئے) "میں نے؟"
بہن۔" ہاں تم نے، اگر لیا ہو تو دیدو، ورنہ ابھی ماں جی آرہی ہیں تمہیں معلوم ہے نا، وہ آج آرہی ہیں، ابھی آدھ گھنٹے کے اندر اندر،

سٹیشن پر نہ پہنچ گئی ہونگی"۔

میں:۔ "میں نے نہیں لیا، میں نے دیکھا بھی نہیں، میں کل طاق کی طرف گیا ہی نہیں"۔

بہن:۔ "عجیب بات ہے، نہ تم نے لیا نہ وشنو نے، تو پھر کیا چور لے گئے"۔

میں:۔ "مجھے کیا معلوم، میں نے نہیں دیکھا، اچھی طرح ڈھونڈو شاید چوہے اٹھا کر لے گئے ہوں"۔

بہن: (میری طرف غور سے دیکھ کر) "چوہے اٹھا کر لے گئے ہوں، یہ خوب رہا، دیکھو ہری! مجھے یقین ہو گیا ہے کہ روپیہ تم نے اٹھایا ہے، اب سچ سچ بتا دو کہاں ہے؟"

مگر میں روتا تھا اور بار بار کہتا تھا میں نے روپیہ نہیں دیکھا۔ اتنے میں وشنو نے آ کر میرا جزدان بہن جی کے سامنے رکھ دیا اور فاتحانہ انداز سے بولا، "لو بہن جی! دیکھو تو، یہ بسکٹ یہ ربڑ، یہ چورن یہ ریوڑیاں یہ پیسے، یہ سب کہاں سے آئے۔ میں لاکھ کہتا تھا تم مانتی ہی نہ تھیں، اب تو یقین ہوا کہ چوری اسی نے کی ہے"۔

بہن جی نے سب چیزیں دیکھیں اور پیسے گن کر کہا، "ارے گل دو آنے بچے ہیں۔ تو کیا چودہ آنے کھا گیا۔ (سر ہلا کر) جبھی رات بھوک نہ تھی، کیا کھایا تھا؟"

میرا خون خشک ہوگیا، مُنہ میں زبان تھی، زبان میں بولنے کی طاقت نہ تھی، مَیں زمین کی طرف دیکھتا تھا اور سوچتا تھا اب کیا ہوگا۔ کل وہی بڑے، انگریزی ٹکیاں اور بسکٹ کھلائے تھے آج مار کھانی ہوگی، مَیں چاہتا تھا کہ کھانا کھائے بغیر سکول بھاگ جاؤں، لیکن افسوس آج اتوار تھا، تقدیر نے فرار کا یہ رستہ بھی بند کر رکھا تھا۔ اب میرے بچاؤ کا ایک ہی طریقہ تھا۔ ماں جی آج نہ آئیں، کسی سبب سے ایک دو دن اور وہیں رُک جائیں یا مجھے بخار چڑھ جائے، نمونیا ہو جائے۔ کبھی کبھی یہ بھی خیال آتا تھا کہ مکان کی چھت گر پڑے اور مَیں نیچے دب جاؤں، لیکن پرماتما نے میری کوئی بات نہ سُنی اور تھوڑی دیر بعد ماں جی آگئیں۔

کسی دُوسرے وقت میں دَوڑ کر ماں جی کی ٹانگوں سے لپٹ جاتا اور کہتا اتنے دن کیوں لگا دیئے لیکن اِس وقت وہ جذبہ وہ جوش وہ اُمنگ کہاں؟ اُلٹا اُن کو دیکھ کر مَیں اندر جا چھپا، مگر شنو کو یہ تاب نہ تھی کہ دو منٹ خاموش رہے، وہ ابھی آرام سے بیٹھی بھی نہ تھیں کہ اُس نے کہا "ماں جی! کل ہری نے روپیہ چُرایا تھا" پتہ نہیں، ماں جی گاڑی میں کسی سے لڑ کر آرہی تھیں یا کچھ اور وجہ تھی لیکن اِس وقت وہ خفا ضرور تھیں، یہ سُن کر اُن کو اَور بھی زہر چڑھ گیا بہن جی سے بولیں "کیا بات ہے موہنی؟"

بہن :۔ کچھ بھی نہیں، پہلے آپ نہا دھولیں، پانی طیار رکھا ہے"۔
ماں جی :۔ نہانا بعد میں ہو گا، یہ بات پہلے ہو گی، کہاں ہے ذرا بُلاؤ تو اُسے میرے سامنے، اب چوری بھی سیکھنے لگا"۔
وشنو (اُنگلی سے دکھا کر) اندر چھپا ہُوا ہے ماں جی! ابھی یہاں بیٹھا تھا تم کو آتے دیکھ کر اندر جا چھپا ہے، چودہ آنے خرچ کر دیئے صرف دو آنے بچے ہیں، کل سارا دن بسکٹ کھاتا رہا ہے۔ رات کھانا بھی نہیں کھایا"۔
بہن (غصہ سے) "بھاگ نہیں یہاں سے چلا ہے بڑی خوشخبری سنانے دو منٹ چُپ رہتا تو کیا تیرا پیٹ پھٹ جاتا، کلموہنا کہیں کا"۔
ماں جی (حیرت سے) "چودہ آنے کھا گیا ایک دن میں۔ کدھر ہے میں اُس کی ہڈّیاں توڑ دونگی، یہ بھی کیا یاد کرے گا، کہ کبھی چوری کی تھی۔ ہری! ادھر ہری! ذرا یہاں آ، اب چھپتا کہاں ہے"؟
مَیں آہستہ آہستہ ماں کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ مگر اس حال میں کہ جیسے جسم میں جان ہی نہ ہو۔ ماں نے میری طرف شربار آنکھوں سے دیکھا اور کہا "تُو نے چوری کی ہے"؟
مَیں نے آنسوؤں سے ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں اُن کی طرف اُٹھائیں اور آہِ سرد بھر کر سر جُھکا لیا۔

ماں - بولتا کیوں نہیں ؟

میں اب بھی چُپ رہا ۔

ماں :- "اب تو جیسے مُنہ میں زبان ہی نہیں ہے، میں کیا پُوچھ رہی ہوں سُنتا ہے یا نہیں"؟

میں حیران تھا، کیا کروں، بولوں تو مُشکل نہ بولوں تو مُشکل، ادھر میری خاموشی ماں کے غصّہ کی آگ پر تیل کا کام کر رہی تھی، لیکن میں بولتا نہ تھا، مجھے اندیشہ تھا کہ بولا تو اور بھی پٹوں گا ۔

آخر ماں کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا، اُنہوں نے روٹیاں بیلنے والا بیلن اُٹھا لیا اور کہا، بُولتا ہے یا نہیں، تُو نے کیوں چوری کی ؟

میں (ڈرتے ڈرتے رُخساروں پر ہاتھ رکھ کر) اب نہ کروں گا ۔

لیکن ابھی فقرہ مکمّل بھی نہ ہوا تھا کہ بیلن میری پیٹھ پر تھا۔ ایک دفعہ "ہائے" کا لفظ میری زبان سے نکلا اور پھر خاموشی طاری ہو گئی، معلوم ہوتا ہے ماں جی کو میری خاموشی سے چڑھ تھی، شاید وہ سوچتی تھیں کہ یہ روتا نہیں ہے اس لئے اسے بھی اور سزا کی ضرورت ہے۔ پھر بیلن اُٹھایا۔ اور میری دلخراش ہائے ایک مرتبہ پھر ہوا میں گونج کر خاموشی طاری ہو گئی۔ اسی طرح میں کئی منٹ تک غلط فہمی میں مار کھاتا رہا۔ آج سوچتا ہوں، اگر ذرا زور سے رونا شروع کر دیتا تو

اتنا کبھی نہ پٹتا۔ لیکن اُس وقت یہ "سیاسی چال" معلوم ہی نہ تھی۔ مَیں جتنا شرافت سے مار کھاتا تھا، ماں جی کو اُتنا ہی زیادہ غُصّہ چڑھتا جاتا تھا۔ پرماتما بھلا کرے بہن کا جس نے مجھے چھڑا لیا۔ ورنہ نہ جانے اُس دن میری قسمت میں کیا بدا تھا؟

دوپہر کے وقت بہن نے آ کر میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور مجھ سے کہا "جا جا کر ماں جی سے معافی مانگ لے، ورنہ گھر سے نکال دینگی"۔

مَیں نہایت شریف لڑکے کی طرح ماں کے پاس گیا اور ہاتھ باندھ کر آہستہ سے بولا، "ماں جی اب کے معاف کر دیں، پھر کبھی ایسی غلطی نہ ہوگی"۔

ماں جی نے مجھے پکڑ کر گلے سے لگا لیا اور پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگیں، روتی تھیں اور کہتی تھیں۔ بیٹا! تُو نے کیوں چوری کی، نہ چوری کرتا، نہ مار کھاتا۔ اُس وقت غصّہ میں مار بیٹھی اب پچھتا رہی ہوں۔

تھوڑی دیر بعد اُنہوں نے میرے لئے بازار سے گرم گرم دودھ منگوایا اور جب تک سامنے بیٹھ کر پلا نہ لیا تب تک اُن کا رنج کم نہ ہُوا اس کے بعد اُنہوں نے مجھے گود میں لے لیا اور پیار کر کے کہا، بیٹا! گھر میں ماں باپ اور مدرسہ میں اُستاد تمہارے ہی لئے

مارتے ہیں۔ اُن کے مارنے کا غصّہ نہیں کیا کرتے ؏

چند دن کے بعد کسی قصور پر مدرسہ میں ماسٹر صاحب نے مجھے اِس طرح مارا جیسے میں نے کسی کو قتل کر دیا ہے۔ لیکن مارنے کے بعد اُن کی آنکھ میں ایک بھی آنسو نہ تھا نہ اُنہوں نے بعد میں مجھے گرم دُودھ پلایا نہ مجھے گود میں لے کر پیار کیا۔ میرے دل میں خیال آیا، ماں بھی مارتی ہے، ماسٹر بھی مارتا ہے، بلاشُبہ دونوں کے دل میں میری بہتری کا خیال ہے، لیکن دونوں کے مارنے میں کتنا فرق ہے۔ ماں مارتی ہے اور روتی ہے ماسٹر مارتا ہے اور بھول جاتا ہے ؏

مطبوعہ

انتظامی پریس حیدرآباد دکن

دیگر تصانیف مہاشہ سُدرشن

نام کتاب	تفصیلِ کتاب و قیمت
چندن	نہایت مفید افسانوں کا مجموعہ۔ جس پر ریویو کرتے ہوئے ایک بنگالی اخبار نے لکھا تھا۔ اگر یہ کتاب بنگالی زبان میں ہوتی تو اس کی ایک ایک کاپی ہر گھر میں ہوتی۔ تقطیع ۵ × ۱/۲ ۷۔ ۳۶۸ صفحے مجلد۔ قیمت تین روپے
محبت کا انتقام	یہ بہترین ناٹک ہے۔ جس کی اشاعت پر مُلک کے طُول و عرض میں شور مچ گیا۔ اس کے ہندی ایڈیشن پر سدرشن صاحب کو حکومتِ پنجاب نے پانسو روپیہ انعام دیا تھا۔ قیمت دو روپے
قوم پرست	یہ بنگال کے ایک نامور ناٹک نویس بابو دویجندر لال رائے کا ایک مشہور تاریخی ناٹک ہے۔ جسے مہاشہ سدرشن نے اہم ردوبدل کے ساتھ ترجمہ کیا۔ قیمت۔ دو روپے
آنریری مجسٹریٹ	تین ایکٹ کا ناٹک۔ مہاشہ سدرشن کے مخصوص انداز میں۔ قیمت دو روپے

تاج کمپنی لمیٹڈ، قرآن منزل، ریلوے روڈ لاہور